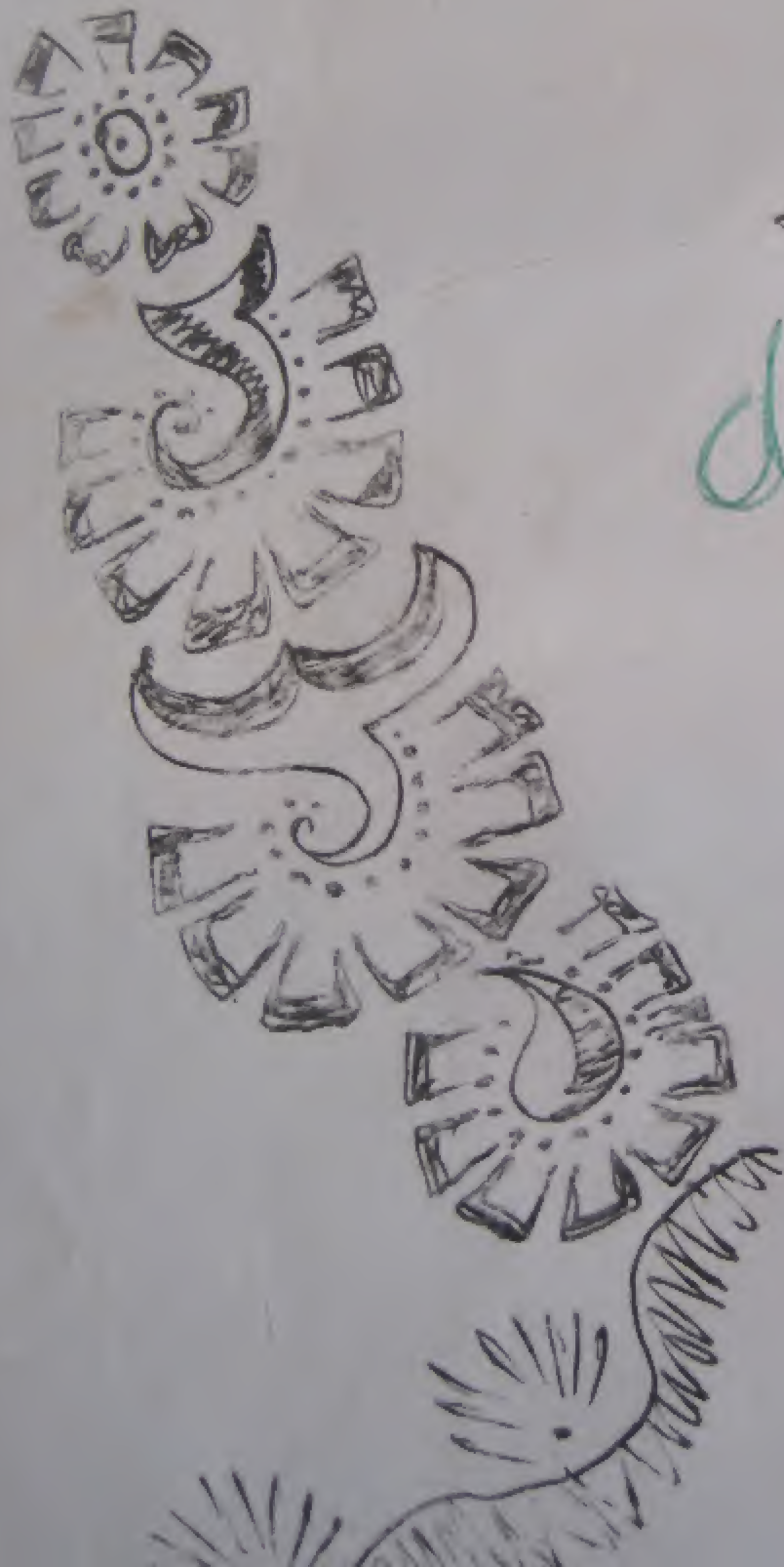


Jan 04



انجیل

چاند نیری دیکا عید میر پاری

سیدہ گل بانو

پیارا مرہاری نرن
اب چھوٹا
بہنوئی
اس

میری	پلکوں	کے	اس	پار
اک	چاند	کے	طلوع	میں
قبولیت	کی	گھڑی	پالینے	تک
آؤ	دعا	کے	سفر	میں
ساتھ	تمہارا		مانگ	لیں

”سنو“ وہ دادا جان کے کمرے سے شام کا اخبار اٹھا دیکھا پھر بانیں۔

”مجھ سے محبت کرو گی؟“ اگلے ہی پل اس کے گدڑیوں سے جو لفظ ہولے سے آزاد ہو کر اک گھیر کر سرگوشی بن کر اس کی سماعتوں میں اترے وہ اسے جیسے تیر کی بنا گئے۔ وہ اب بھی اس کے سامنے بالکل پاس اس کی طرف قدرے جھکا سر ذرا ساخم کیے منتظر سا کھڑا تھا۔ نہ صرف منتظر بلکہ بڑا مضطرب اور بے قرار سا۔

کر سامع چچا کو دینے جارہی تھی جب عقب سے بہت بے تاب لہجے میں پکارے جانے پر اس کے تیز تیز سیڑھیاں اترتے پاؤں یکدم کھم گئے۔ اگلے ہی پل وہ بے اختیار دو سیڑھیاں مزید اتر کے اس کی سمت گھوم گئی وہ اس کے عین سامنے بالکل قریب کھڑا تھا۔

”جی؟“ وہ خاصی عجلت میں تھی۔ روزہ افطار ہونے میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا تھا۔ ابھی لڑکیاں کچن میں تھسی افراتفری کا شکار تھیں۔ وہ سامع چچا کو اخبار دے کر ادھر ہی جارہی تھی کہ عارض کے پکارنے پر اسے ٹھہر جانا پڑا۔ اس کے یوں پکارنے پر وہ اندر ہی اندر جھنجلائی مگر مہمان ہونے کا خیال کر کے اسے ادھر متوجہ ہونا پڑا۔ نہ صرف یہ بلکہ مدھم سی مسکراہٹ بھی ہونٹوں پر سجانی پڑی کیونکہ اپنی آنکھوں میں لہرائی جھنجلاہٹ کا تاثر زائل کرنے کے لیے اسے یہ مسکراہٹ بڑی ضروری اور بروقت آڑ محسوس ہوئی تھی۔ اس کے پوری طرح اپنی طرف متوجہ ہونے پر اس نے لیوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے پہلے دائیں

قدرے مضطرب۔
پکچھا لکچھا بکھر اس۔
معلوم نہیں ان لفظوں کا بوجھ وہ کب سے دل بے تاب کی مضطرب و بے قراری دھڑکنوں میں چھپاے دباے جیسے آج ہار گیا ہو جیسے اس کا تمام ضبط بھاب دے گیا ہو۔ اس کی وہ ہمارا آلودہ خونری آکھیں بھی کہانی سنارہی تھیں۔ بے حد مضبوط اپنی ذات میں سے وگن قدرے موڈی اور لیے دیئے رہنے والے ریزہ سے بندے کا یہ روپ اک پل میں اس کے حواس الٹ گیا تھا اور وہ اڑے بکھرے حواس منتشر اعصاب اور

چنچلی سی دھڑکنوں میں بہت اچانک ہو جانے والی انوکھی
اچھوٹے نوخیز جذبات کی یلغار پر سناکت و جامد کسی پتھر
کی سورتی کی مانند سناکت سی کھڑی اس کی جانب لگتی رہ
گئی تھی۔

ان دو کھلی کھلی کشادہ بخنورا آنکھوں میں یکفخت جل
اٹھنے والے دیپ اس کی روشنی پلکوں پہ پل بھر میں کسی
حسین خواب کی سی محویت سجائے تھے اس محویت کے
ولنشین نازک سایوں تلے اس کی حیرت سے واساکت
رہ جانے والی آنکھوں کے دو نوخیز کنوارے کنول ان دو
بے باک نگاہوں میں مچلتے بے تاب و تڑپ کا دلکش رقص
پیش کرتے اشوفی و شرارت کے خسین جگنوؤں کی اس قدر
جسارت پہ دنگ تھے۔

”انوشہ“ نگین کی بچن سے آنے والی زوردار آواز
پہ وہ جیسے کسی طلسمی سحر سے جھٹکے سے آزاد ہوئی تھی۔ شیشا
جانے والی آنکھوں پہ سیاہ پلکوں کی دراز جھالریں حیا اور
اس کی نگاہوں کی حدت سے جل اٹھنے والے رخساروں
پر گرانی وہ یکفخت تیزی سے پلٹی۔

”انوشہ“ اگلے ہی پل اس کا رخ پڑ جانے والا گداز
ہاتھ ایک مضبوط ہاتھ کی پر حدت سپاٹ لمس والی کشادہ
بستلی میں بھنج کے رہ گیا۔ انوشہ کو جیسے کوئی برقی رواپنے
ہاتھ کو چھوٹی پورے وجود میں سرایت ہوتی محسوس ہوئی
تھی۔ لحظہ بھر کو دھک سے رہ جانے والے من کے ساتھ
پل بھر کے لیے سناکت ہوئی مگر دوسرے ہی پل وہ
سرعت سے اپنا ہاتھ اس کی مضبوط ہوئی گرفت سے
نکالتی تیزی سے قدم بڑھاتی اس سے لمحوں میں دور
ہوتی چلی گئی تھی۔

عارض نے نہایت مایوسی کے عالم میں جھنجلائی سی
نظروں سے پہلے اپنے عقب میں پھر دایمیں دایمیں تکتے
ہوئے اک طویل گہرا سانس سینے کی تہ سے سچ کر فضا
کے سپرد کیا اور پھر دور ہوئی انوشہ کے سر پر نئے سرمئی
آنچل کے نیچے سے جھانکتی کمر تک جھوٹی سیاہ ناگن سی
پٹیا کو لٹکتا بے ساختہ ابرو اچکاتے ہوئے لب سکوز کے

بالوں پہ ہاتھ پھیرتا پلٹ گیا۔
”تو یا گل ہو گیا سے عارض؟“ ذیشان اس کی اس
ترین کارستانی کی تفصیل سننے کے دوران جیسے کرت
سے اچھٹا تھا۔

”تو نے انوشہ سے کہا یہ سب؟“ مارے حیرت و
یقینی اور پریشانی کے وہ بس جیسے بے ہوش ہوئے
قریب قریب تھا۔
”مجبوری تھی بھائی۔“ عارض کندھے اچکا کے
خیزی سے مسکرایا۔

”اب تو اپنی خیر منا اور پہلی فرصت میں دوسرے
بور یا بستر گول کر۔“

”ارے چھوڑ یار۔ میں کوئی تمہاری طرح بزدل
تھوڑی ہوں جو ذرا سی بات پر تھر تھر کانپنے لگوں
کے فضل سے مرد بچہ ہوں۔“ عارض نے اس کی بدحواسی
مذاق اڑایا۔

”اے مرد کے بچے بات مان میری اور نکل لے
گلی سے صبح کا سورج بعد میں نکلے گا پہلے تیری عزت
جنازہ نکلے گا دھڑے۔ تیری اس مردانگی کی تو ایسی کی تمہی
کردے گی وہ پٹاخہ انوشہ۔“ ذیشان نے نتائج کی متوقی
نگینی کا احساس دلانا چاہا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا میری جان۔“ عارض نے
انگشت شہادت کی پشت سے اپنی ٹھوڑی کو دھیرے
دھیرے سہلاتے ہوئے معنی خیزی سے کہا۔ اس کے
ہونٹوں پر یقین بھری مسکراہٹ تھی۔

”میں نے تجھے اول روز ہی بتا دیا تھا کہ تو چاہے
پورے خاندان کی لڑکیوں سے اپنا ٹانگا جوڑ لینا لیکن اس
شعلہ جوالا کو مت چھیڑنا پر تو وہی کرتا ہے جس سے تجھے
باز رکھا جائے۔“ ذیشان کو سخت غصہ آ رہا تھا اس کی اس
جلد بازی میں کی گئی خطرناک حماقت پر۔

”یار کیا کرتا میں پھر بڑا مجبور تھا میں میرے
مہلت بہت کم ہے۔ پہلے ہی پانچ روز سوچ سوچ کے
دیئے۔ تو جانتا ہے عید سے پہلے پہلے میری اوجھ

جس نے اپنی ظاہر کی سہی جس پہ عارض کی موتی موتی لٹا دی
آنکھوں میں بڑی معنی خیزی چمک لہ لگی اور لبوں کے
گداز میں اک بڑی محفوظ کن سی بھر پور مسکراہٹ بکھرتی
چلی گئی۔

”اس میں اتنی حیرانی والی کیا بات ہے یار تو تو جانتا
ہے کہ میں آنکھوں سے جا دو کرتا ہوں۔“ وہ اپنی مسکراتی
جا دو بھری آنکھوں کو اس کی آنکھوں میں ڈال کر مسکرایا۔
”اونہ سوائے ان آنکھوں اور اس کھبے جیسے لمبے قد
کے اور بے بھی کیا تیرے پاس۔“ اس کا ہنوز بے فکر انداز
گہری ہوتی مسکراہٹ ذیشان کو جلا گئی۔ اس کا تو اطمینان
ہوا ہو گیا تھا اور عارض کے کسی بھی انداز سے فکر مندی یا
پچھتاوا نہ جھلک رہا تھا۔ گندمی چہرے پر اطمینان کا راج
تھا۔

”ایزی یار تم کیوں اس قدر پریشان ہو رہے ہو۔“
”تو نے کام ہی ایسا کیا ہے کہ نہ صرف مجھے بلکہ خود
تجھے بھی اپنے اس کارنامے پہ پریشان ہونا چاہیے۔ پر
خدا جانے تو کس ڈھیٹ مٹی کا بنا ہوا ہے۔“ وہ غرایا۔
”چل چھوڑ اتنا سوچ سوچ کر پریشانی سے کہیں
فوت ہی نہ ہو جانا۔“ عارض نے مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا
کر اس کی پیٹھ کو سلی آمیز انداز میں تھپکا۔ وہ اسے گھورنے
لگا۔

”کیسے چھوڑ دوں میں تو سوچ بھی نہ سکتا تھا تو اتنا
احتمقانہ قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔“

”وہ تو میں نے تمہیں یہاں آتے ہی پہلے روز مطلع
کر دیا تھا اپنے ایسے احتمقانہ اقدام کے بارے میں۔“
”پہلے روز تو میں مذاق سمجھا تھا اور دوسرے روز تک تو
میں تیری ساری بات بھول بھی چکا تھا میرے وہم و گمان
میں بھی نہ تھا کہ تو واقعی انوشہ پہ ڈورے ڈالنے کے
چکروں میں مصروف ہو گیا ہے۔“

”شٹ اپ شانی میں نے کوئی ڈورے وورے نہیں
ڈالے کسی پہ جتنا کیا پوری سچائی سے بتا دیا ہے تمہیں۔“
عارض اس کی بات کا برا مان گیا۔ اپنی کردار کشی تو کسی بھی

واپسی ممکن ہے۔“ اس کی خفگی کے خیال سے وہ قدرے
سنجیدہ کر سنجیدگی سے بولا۔

”او میرے بھائی میں نے تیری مدد سے انکار تو نہ کیا
تھا۔ مگر تو جانتا ہے اپنے خاندان کی لڑکیاں ذرا سخت
مزاج ٹاپ کی ہیں اور وہ انوشہ تو سب سے زیادہ سخت
مزاج کی ہے بلکہ سب سے یکدم جدا بالکل ہٹ کر ہے
وہ سب سے یار۔“

”تو یار اب کیا ہو سکتا ہے اب تو تیرا کمان سے نکل
چکا۔“ عارض گال کھجا کے قدرے کھیانی مسکراہٹ اور
لہجے میں معصومیت سمو کر بولا جو اب ذیشان نے چٹکی بجا کر
الٹ کیا۔

”بس تو اب ادھر سے کوچ فرمانے کی فکر کر تیرا دانہ
پانی ادھر سے اٹھ چکا ہے۔“

”اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چک گئیں
کھیت۔“ عارض لا پرواہی سے سر کو جھٹکتا بایاں ہاتھ اٹھا
کے سر صوفے کی بیک پر دھرتے ہوئے انگلیوں کی
پوروں سے پیشانی پر بکھرے بالوں کو سمیٹنے لگا اس کی یہ
بے نیازی ذیشان کو مزید بھڑکا گئی۔

”ایک بھی بال نہیں بچے گا تیرے اس اکلوتے سر پر
جب وہ اپنی چھ ساڑھے چھ انچ کی ہیل کے ساتھ تیری
کھوپڑی میں اپنے غیظ و غضب کی کیل ٹھونکنے لگی۔“
”پرواہ نہیں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ اسے مطلق پرواہ
نہ تھی۔

”مروائے گا تو مروائے گا اپنے ساتھ مجھے بھی۔“

ذیشان اب فکر مند سا پریشانی سے ہاتھ مل رہا تھا۔
”لو تمہاری موت کس حساب میں ہے اس سارے
چکر میں؟“ عارض کو اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دیکھ
کر ہنسی آ گئی۔

”بکواس مت کر۔ میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ
گئے ہیں میں تو حیران ہوں تیری اس قدر جرات پہ آخر
انوشہ نے تیری وہ بکواس سنی کیسے اور تو اس کے ہاتھوں
سے بچ کیسے کیا؟“ اس نے کوئی دسویں بار ایک یہی

تھے سکے وہ ان جیسے کہنے
سب سے سب سے سب سے
ماضی کندی سے اپنا
لی فرصت میں اہر
کوئی تمہاری طرف
ت پر تھر تھر کاٹنے
رض نے اس کی
ن میری اور نکل
انکے گاہے تیری
مروا گئی کی تو
ذیشان نے متان
ہری جان۔
اپنی ٹھوڑی
بڑی سے کہا۔
بتا دیا تھا کہ
جائنا کا جو لینا
کرتا ہے جس
قصہ آ رہا تھا
ت پر
ور تھا میں
روز سوچ
پہلے میری

”یہ بھی ابھی کم سے کیا؟“

”یار شانی تجھے پتا تو ہے میں کتنا مجبور۔“

یہ ناپسندیدہ فعل اس قدر ناقابل یقین و پریشان کن تھا مزید اس کی مجبور مجبور کی رت نے ذیشان کو جلتے تو سے پہ چاہٹھایا۔

”اچھا سوری بس اب میں مزید کچھ نہیں کروں گا۔“
عارض نے فوراً ہاتھ جوڑے ذیشان ایک گہرا سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”دیکھ یار عارض مجھے تیری مجبوری کا بھی اندازہ تھا میں نے تیری مدد کا وعدہ بھی کیا تھا، تلمیں کی ہیلپ لینے کا بھی میرا ارادہ تھا، وہ ضرور ہمارا ساتھ دیتی مگر تجھ سے چند دن صبر نہ ہوا اور یہ نیا کھڑاگ میرے سر پر ٹینشن بنا کر مسلط کر ڈالا ہے۔ ہر کام کا کوئی طریقہ ایک مناسب وقت ہوتا ہے یا نہیں تجھے اگر آنٹی کو دو ٹوک انکار ہی کرنا ہے تو وہ تو کسی دوسرے طریقے سے بھی تو اپنا انکار ان تک پہنچا سکتا تھا۔ کیا یہ ضروری تھا سب۔“

”اچھا کہہ دیا ناں اب مزید کچھ ایسا نہیں کروں گا۔“
”کچھ مزید کی گنجائش ہی کہاں رہنے دی ہے۔ جو ہوا وہ بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ انوشہ کو حقیقت بتا کر کسی نہ کسی طرح کنوئیں کرنا زیادہ مشکل کام نہیں ہوگا کیونکہ وہ بڑی مضبوط سمجھدار اور لا پرواہ سی فطرت کی مالک بڑی سے بڑی پریشانی اور پرالہم کو چٹکیوں میں اڑا دینے والی لڑکی ہے مگر یار عارض ہے تو ایک لڑکی ناں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی سپنوں کی وادیوں کی سحر انگیز رنگینیوں سے نا چاہتے ہوئے بھی متاثر ہو جانے والی جذبوں کی حدتوں سے مبوم ہو کر پکھل جانے والی دھڑکنوں اور چاہتوں خواہشوں سے گندھے نازک احساسات بھرا گداز نازک سادل رکھنے والی ایک نازک کالج جیسی لڑکی۔“

”محض چند لفظوں کی ایک باشعور عاقل و بالغ انسان کی زندگی میں اتنی بھی کیا اہمیت کہ وہ ان کے وقتی سحر میں

لوہب رحمتیں کی سبکی کو جلا رہا تھا۔ اس کے لفظوں کی گہرائی میں چند بے لگتہ باتیں پھر سنا پنی شخص جس بے لگاری سے ہر جگہ سے مٹنے سے تیار رہنے کی سرور فضاوں سے مغرب میں جہاں جذبات کی حدتوں کو جیتی سرور کر شفاف گداز احساسات کی سپائیں کو جلا رہا تھا۔ یہ شرق ہے میری جان، مشرق یہاں جہاں تیار ہے چند لفظوں کا یہ وقتی سحر کسی کی زندگی کو سب سے محسوس ہوئے پس کر دینے والی زنجیر بھی سن جاتا ہے۔“
”نوشت کیا فتویٰ ہے یہ سب حیات اپنی ساری زندگی کے فیصلے کا اہم ترین معاملہ چند لمحائی جذباتیت کو سوچ دینا نہ صرف ایک ہے بلکہ سراسر مضحکہ خیز اور حقانہ اقدام بھی۔ میں سے تو باہر ہے یہ سب عجیب و غریب جہاں باتیں۔“ عارض جیسے بے اختیار کسی اٹھنے پہنچ گیا تھا۔

”سمجھ جائے گا بچے جلد سمجھ جائے گا۔ بندے کو ٹھوکر نہ لگے نا تو اس سے پہلے ہی اس اذیت کو بھلا کون محسوس کر سکتا ہے مگر تجھے یہ چھوڑ اور اب تو انوشہ کے ساتھ تیرے مکان میں خود کو ابھی سے تیار رکھ کیونکہ اس کے پتا تو تو شرافت سے ادھر سے ٹلنے والا نہیں لگتا۔“

”تم خود ہی اسے سب کچھ صاف صاف بتا کر نہ یہ کام اپنے سے تو نہیں ہونے والا اب بچو جی، یہ خوب رہی کرے کوئی بھرے کوئی۔“
تولفت کی ناگوار سلوٹیں ماتھے پر سجا کے پھر وہ اب بھی نہ رکا تھا۔ جب کہ وہ پہلی بار قدرے پریشان سا اسے پکارتا ہی رہ گیا مگر لہجے میں تمام تر سہجہ منکھاس سمونے کے باوجود اسے شدید ناکامی کا سرا ج پڑا۔



ستارہ اس کی سگی ماں تو نہ تھیں مگر انہوں نے اسے

آسانی سے کنواں میں لے لیا۔ ایک سوچے سمجھے معاملہ
 سے ہاگل مختلف اور نئے ماحول میں اپنی زندگی سے کیلبر
 سال گزارنے کے بعد ایک قابل و کامیاب انسان کے
 روپ میں وہ پاکستان آیا تھا مگر ہمیشہ یہیں رہنے کے
 ارادے سے نہیں بلکہ ایک روز پھر وہیں لوٹ جانے کے
 لیے اس کے آنے کی خوشی میں ستارہ نے گھر میں بہت
 خوب صورت سی پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ دورِ زندہ ایک کے
 سبھی رشتے داروں نے شرکت کی تھی اسے کچھ چہرے
 یاد تھے کسی کو وہ بھول گیا تھا سب کا نئے سرے سے اس
 سے تعارف کرایا گیا ہر طرف قہقہے تھے ہر طرف رنگ و
 خوشبو کا سیلاب روشنیوں، مسکراہٹوں کے جلیترنگ کی
 جگمگاتی کھنک، مگر عارض کا دل پھر بھی کسی خالی سونے گھر
 کی طرح ویران اور اداس تھا۔ ہزاروں چہرے تھے مگر ان
 میں اس کے پیارے بابا جان کا مہربان چہرہ نہ تھا۔ نہ اس
 کی جنت اس کے جیون کی انمول خوشی اس کی ماں
 (نگہت بیگم) کا خوب صورت شفیق چہرہ تھا۔ سب کچھ
 بہت خوب صورت تھا بے حد حسین و لغریب رنگوں میں
 دھلا دل کو موہ لینے والا ہر منظر تھا مگر پھر بھی وہ اداس تھا۔
 اس گھر میں قدم رکھتے ہی ان فضاؤں میں سانس لیتے
 ہی جیسے اسے ہر احساس ہر شے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی
 اور ایسے میں اس کے بچپن کے دوست اور کزن ذیشان کی
 ذات ہی تھی جس نے اس کی بے نام سی وحشتوں کے
 سلگتے دکتے الاؤ پر ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار کا کام کیا تھا۔
 خاندان بھر کی حسین، دلنشین، چمکتی، ہنسی، کھلکھلائی
 لڑکیوں اور ان کی سہیلیوں کے جھگڑے کے بیچ شوخ و شریر
 سے مسکراتے قہقہے لٹاتے اس کے دیگر کزنز اسکول کے
 زمانے کے دوستوں نے خوب محفل گرم کر رکھی تھی اور ان
 سب میں ایک طرف اپنی سادگی بھری فطرت اور دوسری
 طرف حاضر جوابی کے باعث ذیشان سب سے نمایاں تھا
 اور عارض کے دل کے سب سے زیادہ قریب۔
 پارٹی کے اختتام کے بعد عارض نے اصرار سے
 ذیشان کو کچھ دن مزید اپنے پاس روک لیا۔ ذیشان نے

ماں جیسا ہی پیار دیا تھا۔ انہوں نے پوری کوشش کی کہ
 اورنگزیب (عارض کے والد) کی وفات کے بعد کسی بھی
 قسم کا احساس عمر ہی عارض کی ذات کا حصہ نہ بنے۔ وہ
 کلاس کالج کا اسٹوڈنٹ تھا جب اورنگزیب کا انتقال
 ہوا ستارہ سے اورنگزیب کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔
 ستارہ کو بچاؤ تو عارض کی وجہ سے کبھی کوئی خاص پریشانی کا
 سامنا نہ کرنا پڑا تھا مگر اورنگزیب کی وفات کے بعد عارض
 شدید ذہنی لوٹ پھوٹ کا شکار ہو کے رہ گیا جس کی وجہ
 سے اس کی شخصیت بھی بری طرح متاثر ہونے لگی گھر
 سے پڑھائی سے اس کا دل اجاڑ سا ہونے لگا۔ حتیٰ کہ
 اپنے دوستوں اور مرن پسند ایٹنی ویٹیز تک سے وہ بری
 طرح اکتانے لگا ارد گرد کے ماحول سے تو کیا وہ تو جیسے
 فضاؤں، ہواؤں تک سے چڑنے لگا تھا۔ شادی کی پہلی
 رات ہی اورنگزیب سے کیا گیا وعدہ ستارہ کو یاد تھا۔
 عارض کی بہتر تعلیم و تربیت اور کامیاب مستقبل کی ان کے
 امید بھرے دل کو اتنی ہی فکر تھی جتنی کہ اورنگزیب کو مگر
 پندرہ سالہ عارض کے مزاج میں ستر اسی سالہ انسان جیسی
 اکتاہٹ اور بے دلی کو دیکھ کر ستارہ کا پریشان ہو جانا لازمی
 سی بات تھی۔ انہوں نے عارض کو تو کبھی سوتیلی اولاد سمجھا
 ہی نہ تھا۔ عارض کے لیے ان کے پاس اپنی اولاد کی طرح
 ہی محبت و شفقت کے بیش بہا خزانے تھے۔ اپنے محبوب
 شوہر کی جیتی اولاد ہونے کے باعث عارض ان کی
 آنکھوں کا بھی تارا بن گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اس سے محبت اور
 بے حد نرمی سے پیش آتی تھیں مگر ان کو اپنی محبت کو اپنی
 نرمی کو کڑھائی میں بدلنا پڑا۔ عارض کے بدلتے روکھے
 پھیکے تیور اور پڑھائی کے معاملے میں بے دلی نے ستارہ کو
 ایک قدرے مشکل مگر حتمی فیصلے پر اکسایا۔ انہوں نے
 اسے اپنے بہنوئی اور بہن کے پاس لندن بھیج دیا۔ ان
 کے تین بیٹے تھے۔ دو عارض سے بڑے اور ایک اس کا
 ہم عمر ستارہ کی بہن صبیحہ اور بہنوئی خاوند بچوں کی تعلیم و
 تربیت کے معاملے میں ستارہ سے بھی زیادہ کڑے تھے۔
 اپنے تینوں بچوں کے ساتھ انہوں نے عارض کو بھی بڑی

ہنسی خوشی اس کی یہ فرمائش پوری کی تھی۔ عارض جو چھ روز سے گھر اور بیڈروم تک ہی خود کو قید کیے ہوئے تھا ستارہ کے حکم پر ذیشان اسے ساتھ لے کر مری کی حسین فرسوں فضاؤں کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ ان جنت نظیر فضاؤں کے فرسوں میں ہفت بھر خود کو گم کیے رہنے کے بعد واپسی پر عارض نے خود کو بے حد فریش تازہ دم محسوس کیا۔ وہ ذیشان کا تہہ دل سے ممنون تھا کہ اس نے اپنی جاب اور دیگر ذمے داریوں کو نظر انداز کر کے بڑے مخلص اور خوب صورت انداز میں اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

ذیشان نے ہفتے بھر کی آوارہ گردی کے بعد گھر جانے کا اعلان کیا تو وہ اسے مزید نہ روک سکا البتہ خود اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا۔

ستارہ اسے زندگی کی ہنسی مسکراتی ڈگر پہ قدم رکھتے دیکھ کر خاصی مطمئن تھیں۔ انہوں نے خوشی خوشی اسے ذیشان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی۔ عارض اور ذیشان ستارہ سے نظر ہچا کر ایک دوسرے کی طرف تکتے آنکھ دبا کر مسکرا دیئے تھے اگر ستارہ کو اس کا ذیشان کے ساتھ جانے کا مقصد معلوم ہو جاتا تو وہ اسے بھی جانے کی اجازت نہ دیتیں۔

معاذ فقط اتنا تھا کہ وہ جس ماحول کا عادی ہو گیا تھا اور جہاں خود کو قدرے پرسکون محسوس کرتا تھا اب اپنی حیات کا اگلا ہر لمحہ وہیں بسر کرنا چاہتا تھا۔ اپنے جیون کی ہر ساعت اور ہر سال جب کہ ستارہ اب اس کو واپس ہمیشہ ہمیش کے لیے یہیں رہنے بسنے کے لیے آمادہ کرنا چاہتی تھیں مگر اپنی برداشت سے زیادہ یہاں ایک بل بھی رہنا عارض کے بس کی بات نہ تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے اگرچہ اپنی اس متضاد خواہش کا کھلا اظہار تو نہ کیا تھا مگر ستارہ کی اب اس کا گھر بسانے کی زور پکڑتی ضد نے عارض کو چوکنا کر دیا ستارہ کی بے پایاں محبت ایک طرف مگر ان کی حاکمانہ فطرت اور بارعب انداز سے وہ شروع ہی سے گھبراتا اور ڈرتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اسے ایک ہی حل سوچا تھا کہ جس کے سہارے وہ

ستارہ کو باقاعدہ انکار تو نہ کر سکتا تھا مگر اپنی الجھن سے تعلیم مکمل ہونے تک کے اس اگلے ایک برس تک اسے سکتا تھا۔ وہ تو ابھی بھی نہیں آنا چاہتا تھا مگر ستارہ کی بیاد کی خبر یا کر خاورِ اقل نے اسے پہلی فرصت میں پاکستان پہنچنے کا حکم دیا۔ کچھ ایسا ہی حکم ستارہ کی طرف سے بھی تھا تو پھر بھلا وہ انکار کیسے کر سکتا تھا۔ ستارہ یہ فانی کا اقل تھا جو کہ بے حد معمولی تھا۔ اس لیے وہ جلد ہی صحت یاب ہو گئی تھیں، مگر عارض کو اپنی خیریت خطرے میں محسوس ہو رہی تھی۔ وہ یہاں رہنا ہی نہ چاہتا تھا تو پھر وہ گھر بسا لینے کی ہمت کہاں سے لاتا۔ اس نے وہ حل ذیشان کے آگے بیان کیا تو اس نے تھوڑا بہت توضیح سرابا مگر اس حل میں اپنے خاندان کی کسی بھی لڑکی کو اسے کر لینے سے سختی سے باز رہنے کی تاکید کی۔ عارض کو اپنے سوچے گئے اس حل کے مطابق کسی لڑکی سے افیر چلنا تھا جو کہ اسکی نڈل بن کر بلکہ بنا کر ستارہ کے علم میں لایا جائے تو وہ اسے جواب طلبی کے لیے اپنے سامنے ضرور لا کر کر تیں اور ایسے میں اسے ان کو پورا پورا یقین دلانا تھا کہ وہ واقعی اس لڑکی کی محبت بلکہ عشق میں ڈوب کر ہوش خواں کھودینے کے ابتدائی مرحلے میں قدم رکھ چکا ہے مگر اس کا فیوچر اس کا کیریئر اس کے لیے بہر حال بات سے اہم ہے لہذا وہ اپنی تعلیم مکمل ہونے سے قبل اپنی ازدواجی زندگی کا پل باندھ لینے کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔ ہاں مگر ایک سال بعد وہ اس لڑکی کو اپنا دے کر اسے اپنا نے ضرور آئے گا اور یہ بات تو ستارہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ اپنے عہد کا پکا ہے چاہے وہ ہو جائے اپنے قول سے پھرنے والا نہیں وہ لوٹ کر ضرور آئے گا۔ یہی سوچ کر وہ اسے مطمئن ہو کر لندن جانے کی اجازت دے دیتیں مگر ذیشان کا خیال تھا کہ ستارہ نہیں تو کم از کم منگنی جیسا بندھن تو وہ ضرور اسی لڑکی کے ساتھ باندھ دینے کی ضد تو کر ہی سکتی ہیں کیونکہ یہ صورت ان کو عارض کے کنوارے پن پر ڈپازٹ کا لیم چسپاں کر کے اس کے لوٹ آنے کی آس کو امید میں

مقصود ہو گا کہ ان کے ارادے تو ایسے ہی دکھائی دیتے تھے۔ لہذا عارض کے گھر سے نکلنے وقت یہ طے ہوا تھا۔ ذیشان کے حکم کے مطابق کہ خاندان کی کسی لڑکی کو نشانہ نہیں بنایا جائے گا اور وہ کوئی بھی لڑکی ہو اسے پہلے ہی یہ ضرور بتادیا جائے گا کہ عارض کے ساتھ اس کا تعلق محض وقتی اور ایک ذرا رہے ہوگا جس کا اس لڑکی کو ایک مقررہ وقت تک ساتھ دینا ہوگا اور اگر بات مغلنی تک پہنچی تو وہ لندن پہنچنے ہی اس بندھن کو توڑنے کا اعلان کر دے گا۔

عارض اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا اور ذیشان اس کی اور اپنی دوستی کے مضبوط رشتے کے آگے چونکہ عارض کا مقصد ناجائز نہ تھا اسی واسطے وہ اس کی التجا پر اس کی مدد یہ آمادہ ہو گیا مگر صنف نازک کے لیے بڑا حساس سادل ہر کھنے والے ذیشان کا یہ کہنا تھا کہ وہ جس لڑکی سے بھی کر ستارہ کے علم میں لایا جائے پوری دیانتداری و شرافت سے پہلے اپنے سامنے ضرور لا کر اس کی اس شرط پر استہزاء یہ ہنستے ہوئے اسے ہی کسی ایسی شق میں ڈوب کر ہوٹل کو اس جھوٹ موٹ کے افینر کے لیے پیش کر سکے اور طے میں قدم رکھ چکا۔ تب ذیشان نے بڑے فخر سے ٹکین کا نام لیا۔ اسے یقین اس کے لیے بہر حال تھا وہ ٹکین کو ضرور آمادہ کر لے گا، بھی تو وہ بھی خاندان کی ہم مکمل ہونے سے لڑکی مگر اس کے علاوہ وہ ذیشان کی پسند اور محبت بھی لینے کے متعلق سوچتا تھا، ٹکین سے اپنی پسند کا اظہار کر چکا تھا سب کے مدد وہ اس لڑکی کو اپنا سامنے یہ اظہار کرنا بھی باقی تھا۔ ذیشان کو بڑا مان تھا کہ اس کا اور یہ بات تو نہ وہ اس کی مشکل اور عارض کی الجھن کا آدھا بوجھ اپنے عہد کا پکا ہے چاہے نازک کندھوں پر بڑے شوق سے اٹھالے گی مگر ذیشان انہیں وہ لوٹ کر رہے بھی جانتا تھا کہ ٹکین اس آمادگی سے پہلے اس کا کسی بھی ٹکین ہو کر لندن جا۔ قسم کا حشر دنیا کے سامنے نشر کر سکتی ہے جس کے لیے اس کا خیال تھا کہ ذیشان کو خود کو ابھی سے تیار کرنا تھا اور پھر ذیشان کی یہ وہ ضرور اسی لڑکی کی تیاری طول پکڑتی چلی گئی اور اس کے ضبط کی لگام اس کے ہاتھوں میں کیونکہ ساتھ سے اس وقت چھوٹ گئی جب ستارہ نے فون پر اسے بلانے پر ڈپازٹ کا لہجہ عید سے قبل گھر آ جانے کی تاکید کی۔

اس کو امید میں وہ دادا جان کے کمرے میں ان کے پاس بیٹھ پر بیٹھا

موبائل پر ستارہ سے بات حکم کرنے کے بعد وہ اس کے گھر کر دھوکہ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ کسی کے سر منی کلر کے سوٹ میں ہم رنگ بڑا سا دھندلا ہوا نکائے نازک سراپے کے گرد اپنے بیڑی جلت چھوے انداز میں دادا جان سے اخبار مانگتی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ جب وہ اخبار لے کر اسی تیزی سے کمرے سے نکلنے کو پہنچی اسی سے وہ جیسے کسی نادیدہ فوت کے زیر اثر اس کے پیچھے کھینچا چلا گیا۔ وہ سیرھیوں پر قدم دھر چکی تھی۔ جب عارض نے ایک گہرے سانس سمیت اسے پکار لیا۔ وہ رکی پھر پلٹے بنا وہ چہرہ اس کی طرف پھیرتی بہت مہمان نواز انداز میں ہولے سے مسکراتی تھی۔ عارض نے دائیں دیکھا جہاں بچن میں مصروف گھر کی خواتین اور لڑکیوں کی آوازوں سے صاف ظاہر تھا کہ کسی بھی لمحے کوئی باہر آ سکتا تھا پھر اس نے بائیں سمت نگاہ کی جہاں ملازمہ تمام بچوں کو لان سے گھیر گھار کے گلاں ڈور کی طرف قدم بڑھاتی دکھائی دیتی۔ ادھر ہی آرہی تھی۔ موقع اچھا تھا بدنامی کے فل چانسز تھے اور جہاں بدنامی ہو وہاں اسکینڈلز خود بخود جنم لے لیتے ہیں۔ اب اسے صرف موقع سے فائدہ اٹھا کر چند پل میں کم سے کم لفظوں کا چناؤ کر کے اپنی شامت کو آواز دینی تھی۔ اسے اپنے بے حد قریب کھڑے پا کر وہ قدرے گھبرا کے اس کی سمت پلٹی۔ دو قدم پیچھے ہو گئی تھی اور پھر اگلے ہی پل عارض نے اپنی طرف سے جیسے اس کی سماعت کو اس وضبط پر ایک ہم ہی بلا سیٹ کیا تھا جسے سننے کے بعد عارض کو اس سے پوری امید تھی کہ وہ زیادہ نہیں تو کم از کم دو پھیر تو اسے ضرور سمجھ بیچ مارے گی کہ وہ اسی قسم کی لڑکی تھی۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والی یہ نہ صرف عارض کا خیال تھا بلکہ پہلے روز سے اب تک کا گہرا مشاہدہ بھی مگر اسے شاگ سا لگا یہ دیکھ کر کہ وہ بے جان جسم کی مانند ساکت سی کھڑی رہ گئی کسی ناقابل یقین منظر کو دیکھ کر ساکت رہ جانے والی آنکھ کی مانند پھرائی ہوئی سی۔

”پھنچر..... پھنچر..... کم آن سلی گرل۔“ اس کا ردال

روٹی کی اٹھائیں کی پکار نے پر وہ حواسوں میں لوٹی
بھی تو سکت پلکیں قوس و قزح سے دلکش رنگوں سے
رنگین ہوتے عارضوں پہ گراتی تیزی سے پلٹی۔

”انوشہ۔“ سخت مایوسی کا شکار ہوتے عارض نے
ایک آخری جان توڑ کوشش سمیت اس کا ہاتھ تھام کر بے
چینی و قدرے جھنجھلاہٹ سے پکارتے ہوئے اس کے
بڑھتے قدموں کو روک کر اس کے قہر کو جگانا چاہا مگر وہ پل
بھر کو اس کی اس جسارت پر ہٹھک کر سکت ہوئی۔ پھر
اگلے ہی پل جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر
کسی متوحش بہرنی کی طرح حواس باختہ سی اس کی دسترس
سے دور ہوئی چلی گئی تھی۔ وہ سخت مایوسی کے عالم میں گہرا
سانس بھرتا پہلوؤں پہ ہاتھ ٹکا کے سرفنی میں ہلا کے رہ
گیا۔ پھر اس نے ارد گرد نگاہ ڈالی کچن سے لڑکیاں
افطاری کے لوازمات سے سچی ڈشز اٹھائے باہر آرہی
تھیں۔ ملازمہ بھی پانچ عدد بچوں کے ہنگامہ خیز جلوس
کے ساتھ اندر آچکی تھی۔ عارض نے نمیش کی سامنے کی
جیب سے نماز کی سفید جالی وار ٹوپی نکال کر سر پر جمائی اور
ایک مرتبہ پھر سخت مایوسی کے عالم میں سرفنی میں ہلاتا دادا
جان کے کمرے کی طرف پلٹ گیا۔

”عارض بھائی! آپ ناحق اتنے پریشان ہوئے
سیدھے سبھاؤ مجھ سے اپنا پرابلم شیئر کر لیتے میں آپ کی
خدمت میں اس سے زیادہ اچھے اور بہتر آئیڈیاز پیش
کر سکتی تھی پھر آپ مجھے عمر بھر داد دیتے رہتے۔“
”تم تمہیں برا نہیں لگا۔ غصہ نہیں آ رہا تمہیں مجھ
پر۔“ یہ لڑکی ایک بار پھر اسے حیران کر گئی تھی۔

”کیجئے اس میں برا ماننے والی بھلا کیا بات ہے اپنی
ذات کو مشکل کٹھنائیوں بے سکونی یا وقت کے گرداب
میں دھنستا محسوس کر کے تو جانور بھی مزاحمت کے بے
اختیاری رد عمل سے دو چار ہو جایا کرتے ہیں تو آپ تو پھر
ایک انسان ہیں اور رہ گئی بات میرے غصہ کرنے کی تو
آپ نے وہ شائبہ نہیں کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں میں
غصیلی ضرور ہوں مگر غلط بات پر غصہ آتا ہے مجھے یوں ہی

بات ہے بات بلا وجہ کاٹ کھانے کو دوڑتا میری حواس
نہیں۔“

”کیا ہوا ابھی کس سوچ میں گم ہیں۔ آپ وہ بھی
قدر پریشانی کے عالم میں۔“ اپنی باتوں کے جواب
وہ اسے یکجہت گم سم سا قدرے حیرانی کے عالم
خاموش و سکت سا پکار اس کی آنکھوں میں جھانکتی
مسکرا کے بولی تو عارض جیسے کسی خیال سے چونک
انگشت شہادت کی پور سے پیشانی ملتا پھر پہلو بدل کر
عقب میں چیئر کی بیک پر دراز کرتا سر کو ہولے سے
میں ہلا گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ
تھی۔

”اچھو نیلی یہ سب۔۔۔ آئی میں تمہارا اس قسم کا
واقعی میرے لیے حیران کن ہے یونو میں تمہیں
ریسٹورنٹ میں اسی لیے لے کر آیا ہوں کہ مجھے ڈر تھا
گھر میں تم کہیں یہ فضول سی حقیقت جاننے کے بعد
سب کے سامنے میرا قیہ ہی نہ کر ڈالو میرے ذہن
تمہیں آؤٹ آف کنٹرول ہونے سے بچانے کو اس
بہتر جگہ کا خیال ہی نہیں آیا۔“ وہ ہلکے پھٹکے انداز میں
جیسے کسی بوجھ سے آزاد ہو کر شکر کا طویل سانس لیتا
پڑا۔ انوشہ بھی دھیرے سے ہنستی سرفنی میں ہلا گئی۔
”اصل میں لڑکیوں کے بارے میں کچھ اس قسم
باتیں سنتا آیا ہوں کہ میرا ذرا اپنی جگہ صحیح بھی تھا۔“
”مثلاً کس قسم کی باتیں سنتے آئے ہیں؟“ انوشہ
سرسری انداز میں کریدا۔

”یہی کہ لڑکیاں اس معاملے خاص طور
لڑکیاں اس معاملے میں بڑی حساس ہوتی ہیں۔ ذرا
سی بات کو اپنی ضد اور انا کا مسئلہ بنا لینے والی۔“ عارض
بات پر انوشہ نے مدھم سی مسکراہٹ سمیت ابرو اٹکا کر
”ذرا سی بات آئی تھنک یہ اتنی ذرا سی بات تو
تھی۔ ضروری تو نہیں کہ جس بات کی میرے نزدیک
اہمیت نہ ہو وہ بات کسی دوسری کے لیے بھی اسی قدر
اہم سی بات ہو۔“

”اچھا چھوٹے مجھے نہیں آتے، انوکھے کے بعد انوکھا جانے سے
تھا۔“ عارضہ مصنوعی تاسف سے بولا تو وہ ہونے سے
مسکرا دی۔

”انوشہ میں ریلی بہت زیادہ کلٹی فیل کر رہا ہوں وہ
سب۔“

”پلیز عارضہ بھائی بھول جائے۔“ وہ فراخ دلی
سے مسکرائی تو دل ہی دل میں جربز ہوتے عارضہ کو مزید
ندامت نے گھیر لیا۔

”انوشہ تم بہت اچھی لڑکی ہو، ویری ویری نائس گرل۔“
اس نے میز کی شفاف چکنی چمکدار سطح پر دھکتے اس کے
دو دھیا گلابی گداز مومی ہاتھ پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھتے
ہوئے اس کے ہاتھ کو ہولے سے دبایا۔ انوشہ کے
چہرے پر پھیلی مسکراہٹ مدھم پڑ گئی۔

”لیکن آپ بالکل بھی اچھے لڑکے نہیں ہیں۔“ انوشہ
اس کے مضبوط ہاتھ تلے دبے اپنے ہاتھ کو آہستگی سے
کشادہ ہتھیلی کے بوجھ سے آزاد کرائی ہوئے سے ہاتھ
کھینچتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اب چلیں؟“ سر پر آنچل درست کرتی وہ سوالیہ
نظروں سے اسے تک رہی تھی۔

”ہاں چلو۔“ عارضہ بٹاشت سے مسکراتا میز سے
گاڑی کی چابیاں اٹھاتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”ارے۔“ اس کے سنگ سنگ قدم اٹھاتے
سیڑھیوں سے گاڑی تک کا فاصلہ طے کرتے ہوئے
معلوم نہیں کیسے بے دھیانی میں وہ توازن کھو کے بری
طرح لڑکھڑائی تھی اور ایسے میں بالکل بے اختیاری طور
پر دو دراز مضبوط بازوؤں نے اسے سنبھال لیا۔ انوشہ کو اپنا
سر اپا کسی آہنی قفس میں جکڑتا محسوس ہوا تھا۔

”سنبھل کے۔“ عارضہ نے اس کے قدموں میں
جھولتے آنچل کے پلو کو اس کے نازک شانے پر ڈالا اسی
پلو کے ہیل تلے دب جانے سے اس کے قدم ڈگمگائے
اور لڑکھڑاکے لہراتا سر اپا عارضہ کی گرفت میں پل بھر کے
لیے بکھر کے سنا تھا۔

”یہ بھی سچ ہے اور یہ بھی کہ ہر کوئی دلہا کی دست
کے جال میں پھنس جانے والا نہیں ہوتا۔“ اس کا انداز
انوشہ کو سراہنے والا تھا۔

”دکھاوے کی محبت۔“ اس کی بات پہ انوشہ پھیکے
سے انداز میں منہ پڑی۔ پھر پل بھر کی خاموشی کے بعد
وہ اس کی مسکرائی آنکھوں میں تکتی دھیرے سے مسکرائی
چلی گئی۔

”دکھاوے کی بھی کوئی محبت ہوا کرتی ہے کہیں
محبت تو فقط محبت ہوتی ہے۔ ہم تو یہی سنتے آئے ہیں۔

ہر انسان کی اپنی اک سوچ ہوتی ہے اب معلوم نہیں آپ
کے لیے محبت کیا اور کیسی ہے لیکن جہاں تک ہم سنتے
آئے ہیں تو محبت تو ایک راز ہے ایک ایسا گہرا پاک
معصوم راز جو بد عملی اور غرض ہوس کی آلائشوں سے پاک

ہے فطرت کا وہ پیغام جسے گناہ سے پاک ہاتھوں نے خدا
کے نیک اور مقبول بندوں کے لیے تیار کیا ہے۔ محبت تو وہ

معصوم تبسم ہے جو تاریک دنیا سے دور کسی جزیرے کے
اندور رہنے والی معصوم پاک پریوں کے نازک ہونٹوں پر

نمایاں ہوتا ہے محبت معصوم پاکیزہ پھولوں کا اک خوب
صورت نازک بے پناہ حسین بے حد دلکش سہرا ہے۔ جسے

بہشت کی حوروں نے فردوس کے باغازت سے بنایا
ہے۔ محبت ایک گداز نازک جذبہ ہے ایسا جو آنکھوں سے

دل میں اور پھر دماغ پر چھا جاتا ہے۔“ بے حد مضبوط
پر اعتماد لہجے میں بولتی وہ اسے لاجواب کر گئی تھی۔

”تمہارے لیے کیا منگواؤں؟“ کتنے ہی پل دنگ رہ
جانے کے بعد وہ جب سنبھل کر بدقت تمام ہوئے سے

مسکرایا تو اس سوال کے علاوہ وہ کچھ بھی کہنے کی پوزیشن
میں ہرگز نہ رہا تھا۔

”سوری عارضہ بھائی میرا بالکل بھی کچھ کھانے منے
کا سوؤ نہیں وہ تو آپ کے اصرار کی وجہ سے میں چلی آئی

افطاری میں اتنا کچھ کھا چکی ہوں کہ اب مزید ایک گھونٹ
پانی کی بھی گنجائش نہیں کم از کم تراویح جیسی منزل طے

کرنے سے پہلے تو بالکل بھی نہیں۔“

”سوری۔“ ہاتھوں کا حصار کھولتے عارض کے ہونٹوں سے نکلا تھا۔ عارض کے چہرے پر نرم دوستانہ سی مسکراہٹ تھی۔ انوشہ کے رخساروں پر حیا کی متمہاٹ آگئی۔

☆☆

”انوشہ! کہاں ہو؟“ جبین اور نگین کی بار بار پڑنے والی ریکاریوں پر بھی اس کے ساکت وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی تھی، ابھی نگین کمرے میں آگئی اور اس کے ساتھ چلائی ہوئی جبین۔

”لیجئے محترمہ ادھر مراقبے کے بھنور میں انکی ہوئی ہیں اور ادھر ہمارا گلا بیٹھ گیا ہے پکار پکار کے۔“

”خدا کی پناہ مسئلہ کیا ہے تم دونوں کے ساتھ۔“ ان دونوں کے یوں آندھی طوفان کی طرح بیڈروم میں داخل ہونے پر چیئر کی بیک پر رکھے سر کو اٹھا کے بند پلکیں وا کرتی جھنجھلائی نظروں سے تکتی بے زاری بھرے انداز میں گویا ہوئی۔

”کنگنی بارنفسیہ (ملازمہ) کو بھیجا مگر مجال ہے جو تم پر ذرا سا بھی اثر ہو جائے کسی بات کا۔“

”خیر اب میں ایسی بھی اثر پروف نہیں۔ کہا تو ہے بھئی نفیسہ کو تھوڑی دیر میں آرہی ہوں میں۔“ وہ مدھم مسکراہٹ سے کہتی پھر سے چیئر کی بیک سے سرٹکا کے پلکیں موند گئی۔ وہ اس وقت کسی سے بات کرنے بلکہ سامنا تک کرنے کے موڈ میں نہ تھی۔ نہ صرف قلبی کیفیت اس کے قابو سے باہر تھی بلکہ ذہن بھی بری طرح سے انتشار سے دو چار تھا۔ گہری ہوتی رات کی تاریکی اسے اپنے اندر اترتی محسوس ہونے لگی۔

”نفیسہ نے تو کہا تھا کہ تمہارا موڈ نہیں ہے نیچے جانے کا۔“ نگین بولی۔

”وہ تو میرا موڈ واقعی نہ تھا ابرار صاحب سے بات کرنے کا مگر تمہارے ساتھ چلنے سے تو انکار نہیں کیا۔“

”ابرار صاحب؟ وہ تمہارے بھی کچھ لگتے ہیں انوشہ آئی تھنک وہ شخص تمہارا باپ ہے۔“

”کنگنی ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد ہم نکلتے گئے میرے سر میں ابھی شدید درد ہے ابھی پانی میں کچھ آرام آ جائے گا۔ میں چین کمرے چلی۔ بے نیاز انداز پر جبین بات کاٹ گئی۔

”دیکھا۔۔۔ دیکھا تم نے ایسا ہی کرتی ہے بھی ابرار چچا کا فون آتا ہے کب تک جھلاؤ گی ابرار خون کے رشتے ہیں یہ تمہاری سر دمہرنی کی اس قدر آسانی سے نہیں چڑھ سکتے۔“ جبین نے دیکھا پھر براہ راست اسے گھورتے ہوئے ایک چبا کر کہا تو انوشہ یونہی بند پلکوں سے مسکراتی چہچہچے جھلاتی رہی۔

”سچ کہتی ہے جبین، انوشہ جب کسی انسان کی آپ کی ذات کا احساس ہو جائے تو۔۔۔“

”تم دونوں مجھے کچھ دیر تنہا نہیں چھوڑ سکتیں۔“ ”کنگنی بے حس ہوگئی ہو تم انوشہ کچھ ایسا یہ خدا نخواستہ تو دیکھنا سر پکڑ کے روؤ گی تم لکھ کے میری یہ بات۔“ جبین کے خفگی سے کہنے پر انوشہ ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

”جو بھی ہونا ہے۔ وہ تو۔۔۔ طے کیا جا چکا ہے۔ طے کیا جا چکا ہے وہ ہی ہوگا اس میں نہ کوئی شک شبہ جو بھی ہوتا ہے وہ طے شدہ ہے مگر جو کیا جاتا ہے انسان کی اپنی ایک پلاننگ ہوتی ہے نہ یہ مقدر آوری ہوتی ہے نہ ہی قسمت کی خرابی کیونکہ جو ہو تو فقط اس پاک و برتر عظیم ذات کی طرف سے۔ مگر جو انسان آپ ہی کرنے کی ٹھان لیتا ہے اپنی منشا یا ضد ہوتی ہے۔ جس میں کبھی بھی حد نہ حساسیت اور انصاف سمایا ہوتا ہے اور کبھی نہ انسانیت نہیں ہوتی اور کیا تم جانتی ہو کہ انسانیت اس مقام پر کھودیتا ہے جب وہ نکلتا ہے اپنی ذات کے لیے سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ بعد آنکھ کھلنے سے لے کر دوبارہ منشی خیل کی مورت کی بانہوں میں دنیا و مافیہا کو پھلا کر سکون کے

بولتے ہوئے پل پھر کو پللیں وا کرتی وہ نے معلوم کس کا
مصلحتاً اتراتی مسخرانہ انداز میں ہنس رہی تھی اور اگلے ہی
پل وہ چیخ جھلانا بھول گئی نازک ہونٹوں پہ پختے خود اتر
سی ہنسی کے نازک غنچے بے ساختہ ہونٹ پہنچنے لگے اپنے کے
باعث شہنشی گداز میں پیوست ہوتے گامی رہی سلوٹوں
میں معدوم ہو گئے جو بلند سحر طراز سراپا بند پلکوں تلے کنول
نیوں کی شفاف جھیلوں میں اک گہرا ارتعاش بکھیر کر
اسے آنکھیں وا کر دینے پہ مجبور کر گیا تھا۔ وہی اب شپٹا
دینے والی حقیقت سمیت نظروں کے سامنے تھا۔ انوشہ کو
دھڑکنوں اور رگ رگ میں گردش کرتے لہو میں اک پر
تپش سی سنسناہٹ تیزی سے پھیلتی محسوس ہوئی وہ
نامعلوم کب سے دروازے کے وسط میں بت بنا کھڑا
تھا۔

”عارض بھیا آپ..... آئیے ناں؟“ اس کی نظروں
کے تعاقب میں دیکھتی نکلین اور جبین کے چہرے پہ
خوشگوار سی مسکراہٹ چھا گئی۔ جبین کی آفر پر وہ یونہی
ساکت پلکوں سے ایک ٹک انوشہ کو تکتا رہا تھا۔ وہ یگانہ
شپٹا کے چہرہ مخالف سمت میں پھیرتی اضطرابی انداز
میں چیخ کے ہتھوں پہ گرفت مضبوط کرتی تیزی سے
پلکیں جھپک کر آنکھوں میں نامعلوم کسی احساس کی چمک
کو ماند کرتی عارض کو ایک شفاف پرسکون جھیل کی مانند
لگی تھی جس کے سکون و سکوت کو توڑنے کے لیے اس
کے ساکت پانی میں پتھر پھینک کر شفاف پانی کی سطح
سے جھانکتے ارد گرد کے تمام مناظر کو یکدم بکھیر دیا
جائے۔

”ہم ابھی تھوڑی دیر میں آرہے تھے عارض بھیا۔“
ان تینوں کی مشترکہ دوست نذا کی طبیعت کچھ ناساز
تھی اس نے شام میں ہی فون پر نکلین کو اپنی خرابی طبیعت
سے آگاہ کیا تو ان دونوں نے فراغت پاتے ہی اس کے
گھر جانے کا پروگرام بنایا۔ تمام مرد حضرات تو مسجد گئے
ہوئے تھے۔ عارض نے سب سے پہلے گھر میں قدم رکھا
تھا۔ جبین نے گرما گرم چائے کے کپ سمیت بڑے لاڈ

موند لینے تک اس کی ہر سوچ ہر فیصلہ اپنی ذات کے لیے
ہوتا ہے۔ اپنے لیے صرف اور صرف اپنے لیے اور یہاں
اس مقام پر وہ اپنے ہی دل کے ساتھ بھی زندگی پر اتر آتا
ہے۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ اپنی ہی
ذات کو منہ کرنے کا ارادہ باندھ لیتا ہے اور سب سے پہلی
گرہ فضول سی اندھی گوئی، بھری انا کی لگاتا ہے پھر خود
غرضی مطلب پرستی، ناشکری، ناجائز خواہشوں، بے حسی،
کینہ و تکبر، غرور بے جا ضد، من مانی، بے رحمی، سنگدلی
مکاری بے حسی اور پتھر لیے فیصلوں کی۔“

”افسوس کی بات ہے بڑے افسوس کی..... تم اپنے
باپ کے لیے اس قسم کے خیالات رکھتی ہو۔“ جبین نے
اسے تاسف بھری نگاہوں سے تکتے ہوئے سرنہی میں
بلایا۔

”باپ کے لیے نہیں انسانیت سے عاری ایک
انسان کے لیے۔“

”زیادتی بہر حال ابرار بیچا کے ساتھ بھی تو ہوئی تھی۔
حدیقہ چچی ان کی محبت تھیں۔“ جبین یقیناً ابرار کی جذباتی
لفظی سے اچھی خاصی متاثر ہونے کے بعد ان ہی کی
زبان بولنے لگی تھی۔ انوشہ کے چہرے پر مسکراہٹ گہری
ہوئی چلی گئی مگر من میں تیزی سے کچھ جھلنے لگا تھا۔

”ہاں محبت اور مرد جب محبت کرتا ہے تو دل و جان
سے کرتا ہے دل و جان سے ہی نہیں دل کی تمام تر
گہرائیوں، عزت و احترام، فخر و استحقاق اور بھرپور توجہ کے
ساتھ کرتا ہے مگر افسوس کہ مرد محبت کرتا ہے محبت ہو جائے
تو اس محبت کی حقیقت اس کے لیے سوائے موہی بخار کے
اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ محبت ہونے سے محبت کرنا
اس کے لیے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور یہاں اس مقام پر
آکر وہ اپنی مردانگی کو بھول جاتا ہے یعنی مرد نہیں رہتا،
انسانیت سے عاری سفاک درندہ بن جاتا ہے۔“

”نظاہر پرسکون ملائمت آمیز ٹھہرے ٹھہرے لہجے
میں سچ جھٹکوں کا زہر تھا، نرم لب و لہجے میں عجیب
اضطراب و فحاشی تھی۔ مدھم مگر بڑے کاٹ دار انداز میں

سے اسے کارڈرائیونگ کی فرمائش پیش کی جس کو عارض نے بڑی فراخ دلانہ مسکراہٹ سمیت پورا کرنے کی ہامی بھری تھی کہ رات کو ان کے تنہا جانے پہ تو خود اسے بھی اعتراض تھا۔

”میرا خیال ہے کہ اب چلیں دیر سے جائیں گے تو واپسی میں بھی دیر ہو جائے گی۔“ وہ دو قدم آگے بڑھا آیا۔
 ”اٹھو انوشہ پہلے ہی تمہاری وجہ سے کافی لیٹ ہو چکے ہیں ہم اگر واداجان آگئے تو وہ کسی صورت بھی اس وقت ہمیں جانے نہیں دیں گے۔“ نکلیں نے کہا۔
 ”جی! تم دونوں جاؤ، پلینز میری طبیعت ٹھیک نہیں، ندا کو میری طرف سے پوچھ لینا، میں کل اس کی طرف جاؤں گی۔“

”او کے۔“ اس سے مزید کوئی بحث عارض کے سامنے مناسب نہ سمجھتے ہوئے وہ دونوں بس اسے خوشامیسی انداز میں گھورتی رہ گئیں۔

”عارض بھیا! پانچ منٹ پلینز ہم ذرا بکے اور فروٹس وغیرہ لے لیں۔“ وہ دونوں عارض سے ریکویسٹ کرتی کمرے سے نکل گئیں۔ وہ ان کے پیچھے جانے کی بجائے وہیں کھڑا رہ گیا تھا اس کی نگاہیں ایک بار پھر سابقہ پوزیشن میں بیٹھی بے نیازی انوشہ کی بند پلکوں میں الجھتی گئیں اور شاید ان ہی نگاہوں کی تپش محسوس کر کے اس کی پلکیں ہولے سے لرز کے واہوکی تھیں اور پھر ان سونی جاگتی مخموری آنکھوں سے نگاہ ملتے ہی انوشہ کو اپنے چہرے پر پھیلتی تپش میں عجیب خنکی سی سرایت ہوتی محسوس ہونے لگی۔

”آپ گئے نہیں؟“ انوشہ کے لبوں پہ مدھم سی مسکراہٹ لرزی۔

”کیا تمہیں میرے جانے کا انتظار ہے؟“ نامعلوم ایسا کیا تھا عارض کے مدھم مسکراتے لہجے میں کہ وہ قدرے گڑبڑا کے سیاہ پلکوں کے ریشمی جال نامانوس سی حدت سے کھلتے مووی عارضوں پر گرائی یکنخت اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کسی کی غلطی گودوں سے معاف کر دینا فراخ دلی نہیں اعلیٰ ظرفی بھی کہلا۔“ وہ بھینا اس کے آخری الفاظ کو اچھی طرح جانچ چکا تھا۔
 ”میں نے کسی سے کہا تو نہیں۔“ وہ ہچکچاکے سے انداز میں نگاہ چرائی اس کی بات کاٹ گئی وہ قدم بڑھا کر قریب آ گیا تھا۔

”اچھی بات ہے کسی سے کہنا بھی مت ورت میں بدنام ہو جاؤں گا۔“ وہ بے تحاشہ ہنستی شوخ نگاہوں سمیت چہرے پر معصوم سی گھبراہٹ طاری کر کے سرگوش کریتا انوشہ کے اندر کی جلائی سی لڑکی کو بیدار کر گیا۔ اس سے قبل کہ وہ باریک تراش والے لبوں کے گداز گوشوں میں دنی مسکراہٹ کو کسی خوشخوار بھری بلی کی مانند جھپٹا مار کر نوچ پھینکنے کی خواہش پر عمل کرنے کے بارے میں سوچتی وہ یکنخت ابرؤوں پہ گھوم کے پلٹتا سر پہ رکھی کروشیے کے باریک نفیس کام والی سفید جالی دار ٹوپی اتار کے کرتے کی جیب میں ڈالتا کمرے سے نکل گیا۔
 ”لفنگا..... لوفر.....“ وہ مٹھیاں بھینچ کر شدید طیش کے عالم میں دانت پیس کے رہ گئی۔ معلوم نہیں کیوں وہ بار بار اس کا لحاظ کرنے پر اس قدر مجبور ہو جاتی تھی۔ اب بھی وہ اس کے کاشن کے کلف لگے لائٹ کافی ٹکر کے شلوار کرتے میں مزید نمایاں ہوتے کشادہ بلند سراپے کو دور ہوتے دیکھ کر گھورتی آنکھوں سمیت بے بسی سے فقط ہونٹ کاٹ کے رہ گئی تھی۔

☆☆

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی میں آپ کو چھوڑ کر کیسے جاسکتی ہوں، وہ بھی اس بے حسن، خود غرض شخص کے لیے۔“

”انوشہ..... کتنی بار سمجھایا ہے کہ تم اس قسم کے الفاظ مت استعمال کیا کرو۔ وہ شخص جیسا بھی سہی مگر تمہارا باپ ہے۔“

”بد قسمتی سے۔“ اس کے چہرے پر طنز یہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ہری بات جتنا اس طرح نہیں کہتے۔“ نورانی نے
مامت سے انوشہ ایک گہرا اور سانس بھرتی ان
کے قریب آنے لگی پھر ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام
کر چومے۔
”ای! آپ نے یہ سوچا بھی کیسے کہ میں امی

میں میری بیٹی میں تمہارے اور ان کے بیچ کسی بھی قسم
کی دوا حال نہیں کرنا چاہتی تم پر ان کا حق ہے بیٹا اور تم
پر ان کے حکم کی قیام فرض۔“
”بس کیجیے امی یہ حقوق یہ فرائض اب یاد آئے ہیں
نہیں۔“

”چلو فون پر بات کرنے میں کیا حرج ہے؟“
درخشاں کسی لمبی بحث میں پڑنا نہیں چاہتی تھیں اس لیے
زنی سے بات بدل گئیں۔
”مجھ میں نہ تو آپ جتنی ہمت ہے نہ ظرف۔“ وہ
روکھائی سے بولی۔

”انوشہ معاف کر دینا خدا کو پسند ہے اور معاف
کرنے والا بھی اس کے پسندیدہ ترین بندوں میں شمار کیا
جاتا ہے بیٹا۔“
”میں کون ہوتی ہوں معاف کرنے نہ کرنے والی
امی! آپ نے معاف کر دیا تو مجھے میں نے بھی معاف
کر دیا مگر جو وہ چاہتے ہیں تو..... نیور
امی۔۔۔ امپابل۔“

”وہ بہت شرمندہ ہیں انوشہ بے حد نادم پھر میں بھلا
انہیں کیوں نہ معاف کر دیتی اتنے برس حدیقہ کی خالی
سوئی رہنے والی گود اور پھر ان کی اچانک موت نے ابرار کو
بالکل توڑ پھوڑ ڈالا ہے۔“ انوشہ ان کی یہ بات نظر انداز کر
گئی۔

”ہاں جب کہ آپ کو ان کے شرمندہ ہونے کا انتظار
بھی تھا ایک عمر گنوا دی آپ نے قیمتی ماہ و سال کی خوب
صورتیاں شادا بیاں تیاگ دیں اپنے انمول حسین
جذبے اپنے معصوم شفاف احساسات اپنی ہنسی زندگی

سے پھر ہر مسئلہ نہیں ایسے وہ مکمل مجھ سے مل گئی
آرزو میں اپنی روح کی رنگینیاں بھی مکمل تو جی دیں۔ آپ
نے فقط ان کے ایک لفظ سوری سننے کی آس میں امی ایک
عمر یہی نہیں کیا کچھ نہ گنوا دیا۔ آپ نے ان کی اس چند
لمحائی شرمساری و ندامت کے احساس سے دو چار ہونے
کی امید میں۔“ اس کی بات پر چند لمحوں کی خاموشی کے
بعد وہ بولے سے مسکرائیں۔

”مجھے ایسی کوئی آس امید یا انتظار نہ تھا۔ بس جو بھی
میرے ساتھ ہوا میں نے اسے اپنی سیاہ بختی سمجھ کر اور خدا
کی رضا جان کر تسلیم کر لیا۔“

”سیاہ بختی... خدا کی رضا... امی کیا خدا کی رضا
کسی ایسے سنگدلانہ فیصلے میں نہیں ہو سکتی ہے جو ایک
ساتھ کئی زندگیوں کو ہر باد گرد ڈالے کتنے ہی دلوں کو توڑ
ڈالے وہ تو رحیم و رحمن ہے ستر ماؤں کے برابر اپنے
بندوں سے شفقت و محبت رکھنے والا اور ستر میں سے کتنی
مائیں ہوں گی جن کی رضا اپنی اولاد کے اجر نے میں ہو
گئی یہ بھی خوب ہے امی کسی کو خوشی مل گئی تو یہ اس کا حق
اور جو کوئی نافر اور ہاتھ اس کی نافرادی خدا کی رضا کہلائے
کیوں امی آخر کیوں کیا ہمیں نہیں معلوم کہ اس کی رضا
کس بات میں ہو سکتی ہے۔ تو پھر ہم کیوں اپنے ہی جیسے
بندوں کے کیے گئے کھوکھلے دو غلے فیصلوں کی سفاکی اور
بے حسی میں خدا کی رضائیں اور مصلحتیں تلاش کرتے
ہیں۔ اگر ہم اپنے ساتھ زیادتی کرنے والوں سے اپنا حق
وصول نہیں کر سکتے۔ اپنے ہی جیسے بندوں سے اپنا حق
نہیں مانگ سکتے تو پھر خدا سے شکوے کیوں کرتے ہیں
کیوں آنسو بہاتی تھیں آپ اپنے رب کے سامنے
کیوں رات رات بھر سجدے میں گر کے روتی، گڑ گڑاتی
تھیں کیوں گلے شکوؤں کے الاؤ میں اپنے صبر و ضبط کو
جلایا کرتی تھیں؟ یہ دنیا ہے امی یہاں پہ کسی کو کچھ مانگنے
سے بھی مل جائے تو بڑی بات ہے ورنہ تو اپنا حق بھی
یہاں چھیننا پڑتا ہے۔“ اس نے پل بھر کورک کر ایک گہرا
سانس لیتے ہوئے ان کے ہاتھوں پر اپنے نازک ہاتھوں

کی گرفت مضبوط کی۔

”سیاہ بختی یہ نہیں کہ کوئی آیا اور آپ کو آپ کے من کو
آپ کی روح کو امیدوں کو روند کر چلا گیا۔ یہ تو خدا کی
طرف سے اس کا ایک ٹیسٹ ہوا۔ امی آپ کی سیاہ بختی
نہیں آپ کی سیاہ بختی تو یہ ہوگی امی کہ میں۔ میں آپ
کو چھوڑ کر ان کے پاس چلی جاؤں۔ عمر بھر کے لیے یا پھر
چند لمحوں کے لیے ہی۔“

”تو پھر کیا چاہتی ہو تم کہ اب اگر صبح کا بھولا شام کو
لوٹ ہی آیا ہے تو ہمیں اسے مایوس کر دینا چاہیے۔“
درخشاں کی آنکھوں اور لہجے میں الجھن آمیز جھنجھلاہٹ در
آئی۔

”امی پلیز سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ وہ اگر بیمار ہیں تو
بھی ان کو یہاں آنا چاہیے۔ بہر صورت اور اپنے رویوں
کی اپنی بے نیازیوں کی اپنی بدسلوکی کی آپ سے معافی
مانگنی چاہیے یہاں آپ کے روبرو۔ مانا کہ وہ شخص جیسا
بھی ہے میرا باپ ہے امی باپ کا مرتبہ بہت بلند ہے اور
مجازی خدا ہونے کے ناتے وہ آپ کے لیے بھی بے حد
افضل ہیں مگر پھر بھی اپنی اس بڑائی کو ذرا دیر کے لیے ان کو
بھولنا تو پڑے گا ہی کہ بہر حال چھوٹوں کے سامنے جھکنا تو
پڑتا ہے چاہے ان کو مار لگائی ہو یا انہیں سینے سے لگانا ہو
جب پہلا کام بخوبی کر چکے ہیں تو پھر دوسری پیش قدمی
کے لیے اس قدر تردد کیوں؟“ آخری فقرے کہتے
ہوئے انوشہ کے چہرے پر ایک تھکی تھکی سی مدھم
مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تو تم نہیں جاؤ گی؟“

”ہاں یہ ہو ہی نہیں سکتا اور آپ بھی نہیں جائیں گی
امی پراس کریں مجھ سے۔“

”یہی تو مشکل ہے میرے لیے شعور بھائی سامع
بھائی اور بابا جان کا بھی یہی حکم ہے اور ادھر تم پہ میری کسی
بات کا اثر ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔“ ان کے انداز و لہجے میں
جھنجھلاہٹ بھری بے بسی تھی۔

”معلوم نہیں ان کا کوئی خیال رکھنے والا بھی ہے وہاں

کہ نہیں۔“ وہ یوں ہی جھنجھلائی منتظر سی نکلی
میں اس کے ہاتھ جھٹک کر سختی وہاں سے چلی گئیں۔
”کتنی کٹھور اور خدی ہو تم انوشہ اگر میری اماں جان
مجھے جان دینے کا حکم بھی دے دیں ناں تو میں پھر کی
تاخیر نہ کروں میں تو۔“ اب تک مسلسل خاموش بیٹھی
بول پڑی۔

”کیا تمہیں لگتا ہے گئی کہ یہ وہ ہی درخشاں ایسا
جو اپنے شوہر کی تصویر سے ہمکلام ہو کر اس سے
شکوے کرتی اتنے برسوں تک الجھتے بکھرتے ہوئے
جوانی کی دلکشیوں سے لبریز انمول ساعتوں کو آنسوؤں
صورت ان پر لٹاتے ہوئے خود سے ہر روز ان کو
معاف نہ کرنے کا عہد کرتی رہی ہیں۔“

”اسی کو وفا کہتے ہیں میری جان وفا خواہشوں
چاہتوں کی حسین رنگین وادیوں میں جنم لینے والے
بے حد نازک مگر درحقیقت بے پناہ حسین بے حد مضبوط
اور انمول جذبے محبت کی مہکتی مہکائی پر طمانیت و پر جدت
نرم مہربان آغوش میں سانس لیتے نازک و معصوم سے
احساس چاہت کی خوابیدہ پلکوں میں مقید رہنے والا خدا
کا اک پر نور تحفہ جو پھوپھا جان کی زندگی کی بلا شبہ ایک
بڑی خوش نصیبی ٹھہرا اور نہ کیا پھوپھا جان کی منتیں التجا میں
ان کو طلاق جیسا بے رحمانہ فیصلہ کرنے سے روک پائیں
بھلا۔“

”بے چاری عورت بظاہر خود کو بڑا مضبوط سمجھتی ہے
اور عقل مند بھی مگر درحقیقت بے حد بے وقوف اور کس
قدر کمزور ہوتی ہے اور اسے اپنی بے وقوفی بے مائیگی اور
بے بسی کا علم تب ہوتا ہے جب وہ اپنی خواہشوں کے
رہنے اور چاہت کے راکھ ہونے کی ناکامی کا تماشہ اپنی
آنکھوں سے دیکھ لیتی ہے اور تب وہ جان مان اور سمجھ لیتی
ہے کہ وہ کس قدر بے مایا اور کتنی بے بس ہے۔“

”خیر سب مرد تو اس قسم کی بھیانک فطرت کے مالک
نہیں ہوتے۔“

”جو ہوتے ہیں میں نے فقط ان کی بات کی ہے۔“

دار و رب کھول کر مطلوبہ سوٹ کی تلاش میں آگاہ و وزارت
انوش اس کے چڑھنے پر ہولے سے جس پر پی۔
اور یہ اپنے عارض بھی کس قسم کے مردوں کی
کٹیری میں شمار ہوتے ہیں۔

”میں کیا جانوں؟“ پل بھر کے لیے وہ تکیوں کے
سوال پر ہنسی مگر اگلے ہی پل ازلی لا پرواہ سے انداز میں
شانے اچکا گئی۔

”کیوں؟ تمہیں تو بڑا دعویٰ ہے اپنی وہ کیا کہتے ہیں
اسے بندہ شناسی نظر شناسی پر۔“

”نارمل سا بندہ ہے بھئی۔“ وہ آرسی کے نازک نیل
کے کام والا جار جٹ کا پلین پر پل کلر کا سوٹ نکال کر اسی
کے پاس صوفے کی طرف چلی آئی۔ آج اس کا ارادہ ندا
کی طرف جانے کا تھا۔

”لیکن یہ نارمل سا بندہ آج کل کچھ کچھ ایب نارمل سا
بندہ دکھائی دینے لگا ہے۔“

”کیا مطلب؟ وہ بے اختیار چونک کر سوٹ صوفے
کی پشت پر ڈالتی اس کے مقابل بیٹھ کر اسے سوالیہ
نگاہوں سے تنگے لگی۔

”کوئی عشق و شوق کا چکر لگتا ہے۔“ نگین دلچسپی سے
مسکراتی تھی۔

”ہیں کیا.....؟“ انوشہ کو حیرت کا جھٹکا سا لگا مگر
اگلے ہی پل وہ نامعلوم کیوں نظر چراتی بے ساختہ پہلو
ظاہر خود کو بڑا مضبوط تبدیل کے رہ گئی۔

”کیسی دھانسو خبر ہے ناں؟“ نگین کو اس کی حیرت
اپنی بے وقوفی بے خبری دے گئی۔

”جب وہ اپنی خواہش
ہونے کی ناکامی کا تاریکی پشت پر دھڑے سوٹ کے ساتھ ہم رنگ دوپٹے کے
پور تب وہ جان ناں اور کو پھیلائی ہوئی بولی۔

”کیوں بھئی خیر سے جوان جہاں بندہ ہے۔ کیا وہ
شوق نہیں کر سکتا کسی سے۔“ نامعلوم کیوں یہ خبر انوشہ
مضطرب ہواٹھنے والے دل کے گداز گوشوں پر
پھیلیاں سی لینے لگی تھی۔ اک ٹھٹھن اس کی سانسوں میں کھل
نے قطع ان کی بات کی

کھل کر پھیلتی چلی جا رہی تھی۔
تھی عجیب بات ہے ناں، دیکھنے میں کیسے برقی

آدم بے زار سے لگتے ہیں عارض بھی وہ لڑکی توں ہو گئی
کیسی ہو گئی میں تو اسی اشتیاق میں مری جا رہی ہوں
چی۔ کیا خبر لندن میں ہی کسی ہوش رہا کافر اور گوری پر
مرٹے ہوں اور بے چاری ستارہ آئی ان کو ادھر قید کر کے
کا سوچتی ہی رہ جائیں۔“

”پوچھ لیا ہوتا ان ہی سے کہ کس کافر اور ہوش رہا کی
زلفوں کی زنجیروں میں جکڑے گئے ہیں۔“ نگین کی بے
چینی اس کے چہرے پہ لفظ بھر کو مسکراہٹ کھیر گئی تھی۔

”ہاں جیسے وہ مجھے بتا ہی تو دیں گے پکے گئے ہیں یہ
بھی مجھے خود ہی معلوم ہو گیا اپنی ہی دھن میں ذیشان کے
روم میں گھستی ہی چلی گئی جب ذیشان کے ساتھ بیٹھے
عارض بھی مجھے اندر آتا دیکھ کر یکدم خاموش ہو گئے یہ کہتے
کہتے کہ ”تو ہمیں بھی عشق ہونے لگا ہے۔“ بس اسی قدر

سن پائی میں اف ان کی آنکھوں کی چمک اور وہ ان کے
چہرے پہ دلفریب سی مسکراہٹ غضب کی تھی جی تو چاہا
خوب خوب کرید کر نام اگلوالوں مگر ذیشان کا پتا ہے ناں
تمہیں جو ذرا سا بھی اپنی پرائیویسی میں کسی کی مداخلت
برداشت کر جائے خاص طور پر جب یہ لڑکے لوگ سب
سے الگ تھلگ ہو کے اکٹھے ہوئے بیٹھے ہوں تو ذیشان
تو بالکل ہی کٹ کھنا بلا بن جاتا ہے۔ کہتا ہے سو طرح کی
باتیں ہوتی ہیں لڑکیاں بھلا اچھی لگتی ہیں بلا وجہ مرد لوگوں
کی آپس کی کمپنی میں فضول میں ٹامک ٹویاں مارتی
ہوتی۔“ نگین اپنی ہی رو میں بولتی چلی جا رہی تھی۔

”نہ جانے تمہارا اگلا شکار تمہارے یہاں سے فرار کا
بہانہ اب کس بے چاری لڑکی کی بے ضروری ذات ٹھہری
ہے۔“ وہ سوچ رہی تھی نامعلوم کیوں ہاتھوں یہ کسی مضبوط
ہاتھ اور کشادہ ہنسی کا سپاٹ پر حدت سانس جاگ اٹھا تھا
جو دن کے اجالے میں اسے اضطراب کی دلدل میں
اتارے رکھتا تھا اور ہر شب میں بے چینیوں کی اتھاہ
گہرائیوں کی طرف دھکیل دیا کرتا تھا اور نازک شانوں

کے گرد سورج کے سلگتے ساکتے ہالے کی مانند کسی کے بازوؤں کا مضبوط دھار راتوں کو اسے سوتے میں جھنجھوڑ کر بیدار کر دیتا اور اس کی سانسیں اس کی دھڑکنیں کسی ٹوٹ جانے والی مالا کے بکھر جانے والے موتیوں کی طرح منتشر ہی ہو کے رہ جاتیں۔

”مجھ سے محبت کرو گی؟“ اک بکبیر بوجھل مدھم سا دلکش سا چاہتوں کی حد میں لٹا تا پریش لاجہ اس کی روح کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتا تو کبھی یہی خواب ناک سا لہجہ۔

”سوری انوشہ وہ۔۔۔ وہ سب ناک تھا اک فضول سا ڈراما میری مجبوری یا پھر جلد بازی میں کی گئی اک گھٹیا حرکت اک چکانہ حماقت کچھ بھی۔۔۔ تم کچھ بھی سمجھ لو اسے۔“

”ممی مجھے میرا گھر یہیں بسا کر قید و محصور کر دینا چاہتی ہیں اور میں ادھر سے فرار چاہتا ہوں ممی کی خواہش میری مجبوری کی اس کشمکش کے باعث مجھے تمہاری ذات کو مارگٹ بنانا پڑا جس کے لیے میں تم سے معذرت۔۔۔“

”اے انوشہ۔“ نگین نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ چونک کر فوراً سنبھلی اور پلو چھوڑ کے ہولے سے مسکرا دی۔

”میں نے پوچھا ہے ندا کی طرف چل رہی ہو؟“
”ہوں چلنا تو ہے اسی لیے تو یہ ساری تیاری ہے۔“
اس نے صوفے کی پشت پر پڑے سوٹ کی سمت اشارہ کیا۔

”ویسے یہ سوچ کیا رہی تھیں تم ابھی اتنی گہرائی میں جا رہی؟“

”سوچ رہی تھی کہ بزدل لوگ عشق فرماتے ہوئے کیسے دیکھتے ہوں گے۔“ اس کے ہونٹوں پہ پھیلی مسکان میں گہرا مسخ تھا۔

”کیا مطلب کون بزدل لوگ؟“ نگین حیران ہوئی۔

”ابن ہوتے ہیں کچھ۔ اپنے اصل سے فرار کی

خواہش رکھنے والے بزدل لوگ۔“ وہ سر ہولے سے جھٹک کر دھیرے سے نفس پڑی۔ نگین بھی کچھ نہ سمجھنے کے باوجود شانے اچکا کے مسکرا دی۔ اسی دم دروازے ناک کیے جانے پر دونوں نے سر گھما کر کھلے دروازے سمت دیکھا اور پھر انوشہ نے یگانگت ہی شپٹا کے اس سمت سے نگاہیں ہٹا لیں۔ وہ کھلے دروازے کے فرش میں کسی تصویر کی مانند فٹ ہوا کھڑا تھا۔

”تو یہ یہ بندہ تو جیسے ہر وقت جاسوسی کے موڈ میں رہتا ہے ابھی اس کا ذکر کرو اور ابھی یہ بوتل کے جن طرح حاضر۔“ شپٹائی سی انوشہ کے چہرے پر کوفت آجھڑ جھنجھلاہٹ کی ہلکی سی پھیلتی گلابی کو عارض نے بغور دیکھا تھا۔

”آئیے ناں عارض بھیا۔ وہاں کیوں کھڑے ہیں۔“ نگین خوشگوار مسکراہٹ سمیت خوش اخلاقی سے گویا ہوئی تو وہ یونہی دروازے کی بالائی چوکھٹ پر تھیلیاں جما کے قدرے آگے کو جھکا کر کھڑا پل بھر کے لیے دھیرے سے مسکرایا۔

”مجھے درختاں پھچھو کی تلاش میں بھیجا ہے امیر نے۔“ آنٹی نے۔“ اسی مدھم مسکراہٹ سمیت وہاں آنے کا مقصد بیان کیا۔ ”غالباً ان کی کسی فرینڈ کا فون ہے۔“ وہ مزید بولا۔

”پھوپھو جان ابھی اٹھ کر گئی ہیں یہاں سے انہیں بھی شاید اسی کال کا انتظار تھا۔ وہ وہیں ڈرائنگ روم میں ہی گئی ہوں گی۔ آپ آئیے تو عارض بھیا کیا یہیں کھڑے کھڑے ہی سب باتیں کیے جائیں گے۔“ نگین کے چہرے کہنے پر وہ دو قدم بڑھا کے اندر آ گیا۔

”ابھی یہاں شاید کسی بزدل کا ذکر بد ہو رہا تھا۔“ وہ یونہی مسکراتے لہجے میں بولا تو انوشہ کا جیسے روم روم اک انجانی حدت سے پکھلنے لگا، نگین عارض کی بات پر ہنس رہی تھی۔

”کسی بزدل کا نہیں، کچھ بزدل لوگوں کا عارض بھیا۔“

”ایک ہی بات ہے۔“ اس کی گہری پر سوچ نکلی تھی

انوش کے چہرے کے نازک لہجے کو انوش نے دیکھا۔
 "تو بے عارض بیباک آپ بھی انوش کی طرح
 یکدم بے سرو پا پائیں کرنے لگ گئے۔"
 بے سرو پا پائیں بڑے کام کی باتیں۔ وہ ہنوز مسکرا
 رہا تھا۔ انوش کو جیسے اپنے جسم کا تمام لہو بڑی تیزی سے
 اپنے چہرے میں سمٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی پیشانی
 اک ہالوں سی پیش سے سلگ اٹھی تھی۔ آج دیتے
 بھاری لہجے کی پیش لودیتی آنکھوں کی حدت نے اس کے
 رگ و پے میں طیش و جھنجلاہٹ کا الاؤ سا ساگا ڈالا
 مسکراہٹ کی کھنک الفاظ کی معنی خیزی اس کے ضبط کا
 امتحان ہی نہیں اس کے لیے ناقابل برداشت بھی تھی بھی
 وہ یکخت اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اب یہاں ایک پل بھی
 ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی۔

"کسی کی بزدلی کا مذاق اڑانا اچھی بات تو نہیں۔
 بزدل لوگ بھی تو دل رکھتے ہیں محبت کر سکتے ہیں۔" اس
 کے کمرے سے نکل جانے کے ارادے کو بھانپ کر وہ
 اچانک اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ وہ اس کے لیے قطعی
 تیار نہ تھی۔ اس لیے اس کے یوں پاس آ جانے پر اپنے
 اندر کی جھنجلاہٹ کو وہ اپنے چہرے اور آنکھوں میں
 جھٹک آنے سے نہ روک پالی۔ نہ ان لفظوں کو لبوں سے
 آزاد ہونے پر جو بزدل ہوتے ہیں وہ کبھی محبت نہیں
 کر سکتے اور جب وہ محبت نہیں کر سکتے تو وہ پھر دغا کرتے
 ہیں اور جو دغا کرتے ہیں ان کے سینے میں دل نہیں اک
 سیاہ داغ ہوتا ہے۔"

وہ بلا جھجک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی
 ازلی خود اعتمادی سمیت بنا کسی لحاظ و ہچکچاہٹ کے الفاظ
 کے تیر برساتی چلی گئی۔ عارض کو پل بھر کے لیے اپنی
 پیشانی سے اک پیش سی پھوٹی محسوس ہوئی۔
 "تم ابھی تک خفا ہو مجھ سے؟" اس کے قدرے
 خجل سے انداز میں کہے گئے بے ساختہ سوال پر وہ یکدم گڑ
 بڑا کے صوفے پر بیٹھی ٹکین کو تکی ایک بار پھر شیشا کے رہ گئی
 مگر اگلے پل سنبھل کر عارض کو گھورا۔

میں بھیجا ہے امیر
 سمیت وہاں آئے
 فرینڈ کا فون ہے
 ہیں یہاں سے
 ہیں ڈرائنگ روم
 بھیا کیا یہیں کہ
 ب گے۔
 ر آ گیا۔
 کر بد ہو رہا تھا
 کا جیسے روم
 خ کی بات
 لوگوں کا
 ری پر سوچ

"میں نے یہ سنا ہے۔"
 "ہٹ جاؤں گا مگر پہلے یہ بتاؤ کہ تمہاری ہار تھی
 کیسے دور ہوئی؟" قدرے خشک سا انداز حد تک عجیب
 لیے ہوئے تھا۔

"میری۔۔۔ میری بھلا آپ سے کیا ہار گئی۔۔۔ وہ
 یکخت اپنے غصے پر قابو پاتی ہو گئی سے منمننا کے نگاہ تیرا
 گئی۔

"میری طرف دیکھ کر کہو یہ بات۔" غیر متوقع
 فرمائش پر انوش کا تو جیسے دماغ ہی بھگ سے اڑ گیا۔

"عارض صاحب۔۔۔ باتوں کے جال میں پھنس
 جانے والی لفظوں کے ریشم میں الجھ جانے والی بہت
 لڑکیاں دیکھی ہوں گی آپ نے مگر میں ہرگز ایسی لڑکی
 نہیں ہوں۔ مانیڈاٹ۔" نامعلوم کیوں اس کا ضبط
 جواب دے گیا۔

"ہوں جانتا ہوں کہ تم ایسی لڑکی نہیں ہو بلکہ ویسی
 لڑکی ہو۔" عارض کے لبوں پر پر لطف سی مسکراہٹ بکھر
 گئی۔ انوش نے بے تحاشہ سلگ کر اس کی بات کے
 جواب میں کچھ کہنے کو لب کھولے۔

"ایسی کی ٹیسی کر دینے والی۔" وہ مزے سے
 مسکراتے ہوئے کہہ گیا اور پھر اسے سخت بے بسی مگر
 جھنجلائے ناگواری کے سے انداز میں اپنی سمت گھورتے
 یا کر عارض کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ یکخت گہری ہو
 گئی اور بھاری لہجے کا ترنم بکھرتا چلا گیا۔

"فرض کرو اس جوگ بگوگ کا ہم نے ڈھونگ رچایا ہو
 فرض کرو بس یہی حقیقت باقی سب کچھ مایا ہو
 فرض کرو یہ روگ ہو جھوٹا جھوٹی پیت ہماری ہو
 فرض کرو اس پیت کے روگ میں سانس بھی ہم پر
 بھاری ہو۔"

"گھٹا بے ہودہ چیئر دیکھ لوں گی میں اسے
 بھی۔۔۔ اچھی طرح سمجھتا کیا ہے خود کو اور اور
 آخر کیا سمجھ رکھا ہے اس نے مجھے۔" چند ہی لمحوں بعد وہ
 زخمی شیرنی کی طرح غیظ و غضب کے سے عالم میں ادھر

اوجھ ٹہل رہی تھی اور اسے لہجے کی گلیجھرتا میں الجھا کے لفظوں کے سحر میں ڈبو کر دم بخود سی چھوڑ کر اس کے کمرے سے نکل کر کوریڈور کی سمت پیش قدمی کرتے عارض نے سرفی میں ہلا کر بے اختیار بے آواز ہنسی سمیت خود کو اتنے زبردست القابات سے نوازے جانے پر اپنے کانوں کو ہاتھ لگا لیے تھے۔

”ہائے انوش تو... وہ تو ہے۔“ نگین جیسے شادی مرگ کی سی کیفیت سے نکل کر خوشی سے جھوم اٹھی اور اسے بھی بانہوں سے تھام کے زور سے گھما ڈالا۔

”شٹ اپ نگ!“ انوش نے شدید غصے بھرے انداز میں اسے ڈپٹے ہوئے اپنی بانہیں جھٹکے سے چھڑا لیں اور پھر وہ اسی غصے جھنجھلاہٹ ناگواری بھرے انداز میں اسے تمام حقیقت بتاتی چلی گئی غصے میں وہ یوں ہی آؤٹ ہو جایا کرتی تھی۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے جو چھپائے ہوئے بھی لفظ لفظ نگین کو بتلاتی چلی گئی جسے سن کر نگین کے دل میں موجود عارض کی قدر ذرا بھی نہیں گھٹی بلکہ اور بھی بڑھ گئی اور وہ خوشی بھی جو عارض کی آنکھوں میں انوشہ کا عکس جھللاتے دیکھ کر نگین کے دل میں جا گئی وہ بھی بے تحاشہ بڑھتی چلی گئی مگر فی الوقت اس نے انوشہ کو مزید چھیڑنے کا ارادہ ترک کر کے خاموشی میں ہی اپنی عافیت جانی تھی۔

☆☆

ابراہیم خان کا بھی اک عام سے مرد کا روایتی قسم کا قصہ تھا۔ ان کے باپ اسرار خان نے اپنی پسند اور خواہش سے ان کی شادی اپنے بے حد قریبی عزیز دوست کی بیٹی سے کی جب کہ ابراہیم حدیقہ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ حدیقہ ملک کے ایک بہت بڑے مل اور کی بیٹی تھی اور ابراہیم کی یونیورسٹی فیلو اور پسند بھی مگر باپ کی قطع تعلق اور عاق کر دینے کی دھمکیوں سے مجبور ہو کے ابراہیم نے ان کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔ یوں درخشاں ان کے گھر میں آگئیں مگر ان کے دل میں جگہ نہ پاسکیں اور شادی کے چار سال بعد ہی ابراہیم کا جھکاؤ پھر سے حدیقہ کی سمت ہو گیا

جو اس عرصے میں بیاہ کر بیوہ ہو چکی تھیں۔ ان سے شادی کے چھ ماہ بعد ایک ایسے کریش میں جاں بحق ہو گئے۔ ابراہیم کے دل میں حدیقہ کو اپنانے کی خواہش سے بیدار ہو گئی۔ انہوں نے حدیقہ سے شادی کر لیا باپ کی عاق کر دینے کی دھمکی ہنوز قائم تھی اس وقت بے سود ثابت ہوئی جب ابراہیم نے حدیقہ سے شادی کرنے کی اجازت نہ ملنے کی صورت میں درخشاں دونوں کو چھوڑ دینے کا اعلان کرنا چاہا تب کی محبت سے مجبور ہو کر درخشاں فیصلہ اپنے ہاتھ میں پر مجبور ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے دل میں چلتی محبت سے بہت مجبور ہو کر ان کی خوشی اور خواہش کی ان کو حدیقہ سے شادی کرنے کی اجازت دے دی مگر وعدے پر کہ ابراہیم بھی طلاق نہیں دیں گے اور حدیقہ ابراہیم کی زندگی میں آگئیں بلکہ ابراہیم کی زندگی میں آگئے کیونکہ اسرار خان ان کو حدیقہ سے شادی نہ روک سکے مگر ابراہیم خان کو عاق کر دینے کے بعد گھر سے نکال دینے سے ان کو دنیا کی کوئی طاقت نہ روک سکی تھی۔ حدیقہ کی ماں پہلے ہی حیات نہ تھیں اور اس چار سال کے عرصے میں ان کے والد کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ اب کروڑوں کی پراپرٹی کی تنہا وارث حدیقہ خود تمام تر برائیاں کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ ابراہیم کی سنگت میں ان کا کالی بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

درخشاں کے میکے سے بڑھتے دباؤ کی وجہ سے درخشاں کو نہ چاہتے ہوئے بھی سسرال کو چھوڑ کر اپنے آجانا پڑا۔ وہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن اور والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ ان کا دکھ سب کے دل میں جیسے زخم ڈال رہتا تھا۔ لاڈلی چپیتی کم عمر بیٹی کے غم اور اس کی ویرانہ اجاز زندگی کے صدمے سے منزہ بیگم (درخشاں کی ماں) جلد ہی زندگی ہار گئیں۔ باپ اور بھائیوں کی خواہش تھی کہ ان کو ابراہیم سے خلع لے کر نئے سرے سے اپنے کی خوشیاں تلاشی چاہئیں مگر درخشاں نے خلع لینے سے صاف انکار کر ڈالا تھا۔ تو پھر دوسری شادی کا تو سوال ہی

Medipaste
DENTAL CREAM
TRIPLE ACTION FORMULA

دانتوں میں درد، سوڑوں سے خون اور حساسیت سے فوری نجات دلائے چند منٹوں میں اثر کا

پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے لیے ابرار کی یادیں اور چار سالہ ننھی انوشہ کا وجود ہی زندگی کا حاصل تھا۔

موبائل کی پیپ ہونے پر موبائل اٹھاتے ہوئے انوشہ کو اپنی ایک کسم پوری فریج ہاشمی کا خیال آیا تھا جو صبح اس کے بوتیک میں آنے کا کہہ کر کسی وجہ سے نہ آ سکی تھی۔ فریج سے اس کی چند ہی ملاقاتیں ہوئی تھیں مگر دونوں میں جلد ہی بے تکلفی اور دوستی استوار ہوتی چلی گئی تھی۔ انوشہ نے اس سے ایسٹ اور ویسٹ کے امتزاج کے کچھ کلرز کے دلفریب و پرکشش ملاپ کا حسین اور یونیک سا تاثر پیش کرتے جدید اسٹائل کے کامدار ڈریسز بنانے سے متعلق بات کی تھی۔ فریج نے ڈریس ڈیزائنرز ہونے کے ناتے اس کے اس آئیڈے کو سراہتے ہوئے اس کی ممکنہ حد تک ہیلپ کا وعدہ بھی کیا تھا۔ فریج کا ڈرائیور آکر صبح بوتیک سے فریج کا مطلوبہ ڈریس لے گیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ میڈم شام میں آپ سے فون پر بات کریں گی کیونکہ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے وہ آج یہاں خود نہ آ سکیں۔

”ہیلو۔“ اس کے ذہن میں ابھی تک فریج کا ہی خیال تھا۔

وہ لوگ جو کج ادا لوگ ہوتے ہیں وہ لوگ جسم و جاں کا روگ ہوتے ہیں کبھی دھڑکن سے سانسوں سا بخوک ہوتے ہیں کبھی عمر بھر کا سلگتا سوگ ہوتے ہیں۔

”وہ سنی طرف سے ابھرنے والے بوجھل و قدرے مضحکہ خیز سا بھاری لب و لہجے کا مدھم گہم سا دلفریب ردھم انوشہ کی ساتمتوں کو پکھلتا پل بھر کے لیے تھم جانے والی دھڑکنوں میں غصہ کی پانچل مچا گیا۔ وہ کھلی کھڑکی کے پاس دم مارتے کھڑکی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

”سنو بے سکندل ٹوکی۔“ اس منہ کو۔۔۔ اس منہ میں جنم لینے والی اک حسین چاہت کو میں اپنی حیات کے پل پل کو بھوکا سنوار دیتے والا اک خوب صورت دلفریب بھوک بنانا چاہتا ہوں۔ نہیں تم اس تمنا کو عمر بھر کا سوگ نہ

بنادینا۔۔۔ میں۔۔۔ میں یہ سب سننے کی بجائے دیکھنے۔۔۔ میں۔۔۔ میں یہ سب سننے کی بجائے دیکھنے۔۔۔

”عادی تو میں بھی ہرگز نہ تھا کسی کو سونے کا چاہتے رہنے کی خواہشوں کے جنگلوں میں جھلنے کا۔“ انوشہ کے تیز رو کھٹے ناگوار لہجے کے جواب میں اس کے مدھم تھمے تھمے لہجے میں ہلکا سا شکوہ جھلکا۔

”کیا چاہتے ہیں آپ آخر؟ میرا سکون سے اجیرن کر ڈالا ہے آپ نے۔“ وہ لکھنوت جھنجھلا اٹھی۔

”میں چاہتا ہوں تم سے بات کرنا تم سے ملنے اور پھر مل ہی جانا عمر بھر کے لیے۔“ گہم لہجہ شوخ ہونے لگا۔

”تو پھر ہم کب مل رہے ہیں۔“ بے حد درشت خوشگوار انداز تھا۔

”کبھی نہیں۔“ وہ جل ہی تو اٹھی اس کے اس انداز پر۔

”اب میں اتنا بھی برا نہیں۔“ ہنوز مسکراتا لہجہ تھا۔

”ہاں اتنے بھی نہیں بلکہ آپ بے حد برے ہیں۔“ وہ بنا کسی لحاظ و مروت کے کہہ گئی۔ یہ شخص مسلسل اس کے ضبط سے کھیلتا چلا آ رہا تھا مگر اب وہ مزید کوئی رعایت برتنے نہ چاہتی تھی۔

”پھر آئی تھنک۔۔۔۔۔ مجھے ہی تمہارے پاس آ جانا چاہیے۔“

”نو۔۔۔۔۔ نیور۔۔۔۔۔ میں کسی طور بھی آپ کا سامنا نہیں کرنا نہیں چاہتی۔“ انوشہ نے اس کے فیصلہ کن مطلبی انداز پر یکدم تیز تنکھے لہجے میں کہتے ہوئے اپنے پیڑ کے کھلے دروازے کو گھبرائی نظروں سے دیکھا۔

”تو پھر ٹھیک ہے تمہیں خود میرے سامنے آنا پڑے گا۔ میں جانتا ہوں میری وجہ سے تم کل سے کمرے میں خود کو قید کیے ہوئے ہو۔ بری بات۔۔۔۔۔ اس طرح تو مجھے چھپتے ہیں۔“

”کیوں ملنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟“

”کیوں ملنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟“

بہت مضبوط سے پوچھا۔
 "تم ملو تو پھر بتاؤں گا۔" وہی دوستانہ انداز تھا۔
 "اور اگر میں نہ جانتا چاہوں نہ ملنا چاہوں تو؟"
 "تو سوچ لو ایک برا آدمی کیا کر سکتا ہے پھر۔"
 "آپ دھمکی دے رہے ہیں مجھے؟ میں ان گیدڑ
 جھکیوں سے ڈرنے والی خائف ہو جانے والی کوئی احمق
 لڑکی نہیں ہوں" سمجھے آپ۔ "وہ جیسے تمام تر ضبط کھو کے
 جاگواڑی کے شدید احساس سے چیخ اٹھی۔

"کیا یہی بات تم اس کھڑکی سے بائیں سمت لان کی
 طرف دیکھتے ہوئے پھر سے کہہ سکتی ہو۔" اس غیر متوقع
 عجیب و غریب فرمائش پر انوشہ کی نگاہیں غیر ارادی طور پر
 اٹھتی چلی گئیں اور اگلے ہی پل اس کی دھڑکنوں کے ساتھ
 اس کی سانسیں بھی تھمنے لگیں لان میں چیمبرز پر ذیشان
 سامع چچا شعور بچا اور دادا جان اپنی اپنی چیمبر پر براجمان
 باتوں میں مصروف تھے اور ان سے چند ہی گز کے فاصلے
 پر لان کی سبز گھاس پر وہ ننگے پاؤں ادھر ادھر ٹھٹھلتا موبائل
 کان سے لگائے ادھر کھڑکی کی سمت ہی جانے کب سے
 تنگے جا رہا تھا۔ انوشہ کے متوجہ ہوتے ہی اس نے عقب
 میں کمریہ دھرا بایاں ہاتھ اٹھا کے سب کی نظر بچا کر اک
 گہری مسکراہٹ سمیت اس کی سمت ہاتھ ہلا کے دوستانہ
 انداز میں وٹس کیا تھا۔ انوشہ کا چہرہ یکاخت اک انجانی تپش
 سے سلگ اٹھا۔ وہ کتنے ہی پل بھیج جانے والے ہونٹوں
 سمیت سن سی کھڑی اس کی سمت تکتی رہی تھی بلیک پینٹ
 پر براؤن شرٹ میں وہ نکھر نکھر اس کا کھڑا تھا۔

"تم مجھ سے ملنے کا میری بات سننے کا وعدہ نہیں کرو
 گی تو میں وہ بات ابھی یہیں پر چیخ چیخ کے سب کے
 سامنے بتا دوں گا اور اسے خالی خولی دھمکی مت سمجھنا بلکہ
 ایک قول سمجھنا ایک مرد کا قول۔" اس کی بات پر انوشہ گھبرا
 گئی۔

میں آپ کی بات ماننے کو تیار ہوں مگر باہر
 کہیں نہیں۔ یہیں گھر میں۔" اس کی بے باکی کا ایک
 خطرناک مظاہرہ وہ پہلے ہی ٹلین کے سامنے دیکھ اور جھکت

چکی تھی۔ وہ کیا بات کہنا چاہتا ہے اور اس سے کیا سنا رہی
 کے رو برو ملاقات کے لیے مجبور کیوں کر رہا تھا۔ وہ کیا
 چاہتا تھا۔ یہ اس کا لہجہ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ
 انوشہ ایک بار پھر کسی خوش فہمی کی شکار نہیں ہونا چاہتی تھی۔
 "انوشہ ہے ایک بہت ضروری بات کرنی چاہی مجھے۔"
 اور پھر رات کو ٹلین حسین راہیلہ عدیلہ کے درمیان اسے
 ٹی وی لائونج میں موجود یا کر اس کے چہرے پر ایک مدھم
 مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ انوشہ کی گود میں رستے کشن پر
 دھری چلغوزوں سے بھری پلیٹ میں سے جھک کر
 چلغوزے مٹھی میں بھر کے وہ قدرے فاصلے پر بڑے
 سنگل صوفے پر بیٹھتا اچانک بولا تھا۔ انوشہ نے گڑبڑا
 کے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی سیاہ دراز پلکوں تلے
 لابی حسین آنکھوں میں در آنے والی بے بسی کو کھلتے
 ہوئے عارض کے لبوں کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔
 اس نے چلغوزہ چھیل کر لبوں میں دبا کے پھر منہ میں منتقل
 کرنے کے بعد اطمینان سے کھاتے ہوئے سسپنس کو
 چند لمحے کے لیے برقرار رکھا تھا۔

"یہ....." اس نے دوسرا چلغوزہ چھیل کر منہ میں
 ڈالتے ہوئے انوشہ کو یونہی گہری مسکراہٹ سمیت تکا
 تھا۔ "کافی بہت اچھی بنائی ہے۔" مسکراتی نگاہیں انوشہ
 کی سٹپٹائی سی آنکھوں کی پریشان بے بس روشنیوں میں
 الجھائے الجھائے اس نے بات مکمل کی تو انوشہ کے
 چہرے پر اطمینان بکھر گیا جب کہ ٹلین کو انوشہ کی گھبراہٹ
 اور عارض کی معصوم سی شرارت پر بڑے زور کی ہنسی آئی تھی
 جس پر انوشہ نے اس کو کچا چبا جانے والی نظروں سے
 دیکھا اور عارض یونہی اطمینان سے بیٹھا چلغوزے چھیل
 چھیل کر منہ میں ڈالتا مزے سے مسکراتا انوشہ کو تکتا رہا۔
 "عارض بھیا! آپ کی مٹی نے آپ کو یہاں آپ کی
 شادی کرنے کے لیے بلایا ہے نا؟" چودہ سالہ راہیلہ
 نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"تمہیں میری بات کا یقین نہیں میں نے ذیشان
 بھیا کو ماما سے بات کرتے ہوئے خود سنا تھا۔" راہیلہ سے

دو برس بڑی عدیلہ کو اس کی عارض سے تصدیق ڈرانے بھائی تھی۔

”سنا تو میں نے بھی کچھ ایسا ہی ہے۔“ وہ اپنے دونوں شغل بدستور جاری رکھے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

”تو پھر آپ کس سے شادی کریں گے؟“ راحیلہ کے سوال میں معصومہ اشتیاق تھا۔

”بھئی ظاہر ہے کہ ایک لڑکی سے شادی کروں گا۔“

عارض کی نظریں بدستور انوشہ کی جھکی پلکوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ وہ بظاہر بے نیازی سر جھکا کے بیٹھی شہادت کی انگلی کی مومی پور سے اپنے سامنے رکھی پلیٹ میں بھرے چلغوزوں کو ادھر ادھر منتشر کرتی اندر ہی اندر اس کی نگاہوں کی تپش اپنے چہرے پہ محسوس کرتی سلگی جا رہی تھی۔ اسی پل قدموں کی آہٹ اور بولنے کی آوازوں پر

جبین کچھ کہنے کا ارادہ کرتی پھر اندر آنے والوں کو دیکھتی خاموش رہ گئی۔ ذیشان دونوں ہاتھوں میں سوٹ کیس

اٹھائے بے حد خوش خوش پر مسرت چہرے سمیت تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ادھر بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے

شعور چچا (ذیشان کے والد) تھے اور ان کے ساتھ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے اندر داخل ہوتے شخص کے

چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ان سب میں کھلبلی سی مچ گئی حیرت بے یقینی و مسرت کے ملے جلے احساسات سمیت

وہ سب خواب کی سی کیفیت میں گھرے گھرے گنگ سے رہ گئے تھے۔ اپنی گود میں پڑی پلیٹ سے یککھت

بے نیاز ہوتی جھٹکے سے کھڑی ہونی انوشہ بالکل غیر ارادی طور پر غیر محسوس انداز میں عارض کے اونچے کشادہ

سر اپنے کی اوٹ میں چھپ گئی تھی۔

”ارے بھئی یہ اس طرح کھڑے کیا دیکھ رہے ہو بیٹا تم لوگ آگے بڑھ کر ویکلم بولو بیٹا اپنے پھوپھا جان کو۔“

شعور چچا کی پیار بھری ڈانٹ پر اپنی سمت جھل جھل ہوئے ہوئے مسکراتی جبین نکمین راحیلہ عدیلہ کو قدم بڑھاتے دیکھتے ابرار کی تھکی تھکی نادم نگاہیں بے تابانہ انداز میں ان

چاروں کے چہرے میں جانے کس چہرے کو موصوفی چھین۔

”یہ سب پیاری پیاری بچیاں ماشاء اللہ تمہاری بھتیجیاں عارض پکڑو بیٹا اس کو۔“ تعارف کراستے شعور

یککھت غیر متوقع ہدایت پر عارض نے ان کے اشارے یکدم اپنے عقب میں کھڑی انوشہ کو مڑ کے تیزی سے

قدم بڑھاتے دیکھ کر اسے بے اختیار بازو سے پار سے روک لیا اور پھر انوشہ کی کمزوری مزاحمت کو یکسر نظر انداز

کرتے عارض نے اسے عقب سے شانوں سے تھام کر ابرار کے قریب لے جا کھڑا کیا تھا۔ وہ چہرہ ہاتھوں میں

چھپاتی ان کی طرف دیکھنے سے بھی گریزاں تھی اور اس کے محلے گریزاں بدگمانی کی لہروں میں لیے ہوئے

کے گرد یککھت ایک مہربان آغوش کا شفیق حصار قائم کیا گیا۔

”انوشہ..... انوشہ میری بیٹی میری جان میری بچی۔ اسے شفیق سننے سے لگائے شفقت بھری بے تابی سے

آغوش میں بھینچ کر اس کے سر ہاتھوں پیشانی کو چومے ابرار تمام تر ضبط کھو کے بے اختیار رو پڑے تھے۔

”مجھے معاف کر دو بیٹے معاف کر دو اپنے اس بدنصیب گناہ گار باپ کو معاف کر دو میری

بچی..... میری بچی..... معاف کر دو..... بھٹک گیا تھا میں..... دولت کی ہوس نے تمہارے اس مجرم باپ کی

آنکھوں پر لالچ..... بے رحمی اور خود غرضی کی پٹی باندھ دی تھی۔ بیٹے بہت ترپا ہوں میں..... بہت رویا ہوں بہت

چوٹ کھائی ہے میں نے روح تک زخم زخم ہو چکا ہوں اب اور تاب نہیں ہے مجھ میں مزید ہمت اور برداشت

نہیں ہے مجھ میں۔ اپنے اصل سے فرار حاصل کرتے کرتے اپنی ذات تک کو فنا کر چکا ہوں را کھ کا ڈھیر ہو گیا

ہوں بیٹے یہ چند سانسیں باقی ہیں یہ بھی خاکستر ہونے کا ہیں را کھ بن کر بکھر نے کے بعد بالآخر یہ بھی بے نام و

نشان ہو جائیں گی۔ میری ذات کے تکبر میرے زعم کی مانند یہ بھی فنا ہو جائیں گی اگر..... اگر تم نے مجھے معاف

سے تیزی سے جانے کو بڑھی۔
 ”میں نے دیکھی ہیں۔“ ٹکین نے اسی تیزی سے
 بڑھ کر اس کی راہ روکی۔ ”میں نے دیکھی ہیں ان کی
 آنکھیں اس سے کہ جب ان میں تمہارا عکس بولتا ہے وہ
 عالم جب وہ شخص تمہاری چاہتوں کے گرداب میں سرتاپا
 جکڑا دکھائی دیتا ہے۔ خود فراموشی کی وہ کیفیت کہ جب تم
 اس کے سامنے ہو اور وہ چار اطراف سے ہر شے سے ہر
 بات سے حتیٰ کہ اپنے آپ تک سے بیگانہ ہو جاتا ہے
 انوش۔“ ٹکین نے ہولے ہولے کہتے ہوئے اس کے پیچ
 پڑ جانے والے ہاتھوں کو محبت سے تھام کر کچھ مزید کہنے کو
 لب واکے تھے مگر انوش بے ساختہ ہونٹ پیچتی اس کے
 ہاتھوں سے ہاتھ چھڑاتی یکایک اس سے دور ہوتی
 نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ ٹکین بے بسی سے مٹھیاں
 جھنجھتی اس خود سر احمق لڑکی کو دل ہی دل میں برا بھلا کہنے
 کے سوا کچھ نہ کر سکتی تھی۔

”تم..... گھمنڈی..... بے وقوف لڑکی..... آخر سمجھتی
 کیا ہو تم خود کو۔“ وہ ٹکین سے جان چھڑاتی نہ چاہنے کے
 باوجود اپنے بیڈروم سے نکلنے کے بعد امی کے بیڈروم میں
 پناہ لینے چلی آئی تھی اور دو روز سے موقع کی تلاش میں
 بے چین و مضطرب عارض کے جیسے روم روم میں برق بھر
 گئی تھی اور پھر اسے اچانک اپنے روبرو پا کے بے طرح
 گڑبڑا جانے والی انوشہ کے اوسان جیسے لمحے بھر میں خطا
 ہوئے تھے۔ اس پر مزید عارض کے لکھت ضبط کھوکھو کے
 بے طرح چیخ کے گھٹے گھٹے انداز میں پھٹ پڑنے پر
 انوشہ کا وجود اور گوں میں گردش کرتا لہو تک تلخ سا پڑ گیا۔
 ”کسی کے جذبات کا مذاق اڑانے کا“ کسی کی ذات
 کی بے بسی کا تماشا بنانے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔“ بے حد
 خفگی بھرا ہوا سہلکا لہجہ تھا۔ بلکی بلکی بڑھی ہوئی شیو والے
 مضطرب بچے بچے چہرے پر بے تحاشہ لودیتی الجھی
 جھنجھائی نگاہوں سے نگاہ چرائی وہ بے ساختہ رخ پھیر
 کے تیزی سے کمر سے نکلنے لگی مگر عارض نے اس کی
 راہ میں حائل ہوتے ہوئے اس کے ارادے کو ناکام

”بہت چاہا بہت چاہا میں نے کہ تمہاری اس
 دھرم انا کے زعم کو تمہارے اس اعتقاد کے بھرم کو نہ توڑ
 مگر خود تم نے مجھے اس پر مجبور کیا ہے۔“ اس کا جارحانہ
 تباہ انداز بگڑے اکھڑے تیوز بھاری لب و لہجہ میں
 کڑختی اور درشتگی پہ انوشہ کی دھڑکنیں اور حواس
 تیزی سے منتشر ہوئے تھے مگر وہ خود کو کسی طور بھی اس
 سامنے کمزور ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی۔

”کیوں چھپنا چاہتی ہو کیوں بھاگنا چاہتی ہو
 سے۔“ اس کے ایک بار پھر تیزی سے پلٹ کر دروازے
 کی سمت پیش قدمی کرنے پر عارض نے یکدم بھڑک
 ایک بار پھر اس کا راستہ روک لیا۔

”محبت کرنا جب کوئی جرم نہیں تو محبت ہونا تو
 ایک بالکل غیر ارادی یکسر بے اختیاری جذبہ ہے۔
 سچو اس انمول احساس کی کونپلوں کو مت روندو اس
 جذبے کی ان چھوٹی پاکیزہ شدتوں کو ایسا نہ ہو کہ یہ
 جارحانہ اقدام تم سے تمہاری ذات کی پہچان چھین لے
 کہیں تم اپنے آپ کو ہی نہ کھودو۔“

”پلیز..... پیچھا..... پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے
 آپ میرا آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟“ وہ اس کے بے حد
 پتھر لیے لہجے سپاٹ انداز میں کھری کھری سناتے
 یکدم ہی ضبط گنوا کے بے طرح چیخ کے رہ گئی۔

”میں کیا چاہتا ہوں کیا تم نہیں جانتیں میں وہ چاہتا
 ہوں جو تم چاہتی ہو مگر جس کا اعتراف تمہارے لیے
 تمہاری انا کی شان کے خلاف ہے ایسا ہی ہے ناں بلو
 پھر شاید تم میری اک ذرا سی بھول کی سزا اپنی اس بے حد
 بے نیازی کے زہر میں مجھے نشروں کی صورت مجھے
 چاہتی ہو جو میری روح کو پیل پیل تا عمر چھید چھید کر
 کرتی رہے میں تو تمہیں بہت سمجھدار اور اک مہربان لڑکی
 سمجھتا تھا مگر افسوس کہ اس مہربان لڑکی نے مجھے میرے
 دل کو بہت بری طرح سے گھائل کر ڈالا ہے۔ کہیں کا
 تو نہ چھوڑا مجھے مگر سنو مجھے اپنے جیون کے کسی بھی

”یاد رکھنا اپنے اور میرے بیچ نا کسی خواہش کا کسی پلاننگ کے بندھ جانے والے اس بندھن سے متعلق کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے یاد رکھنا میری یہ بات۔“ وہ قطعی اور بے لچک لہجے میں چند اور سکتے سکتے الفاظ کی پیش اور اس کے نازک موی نقوش کو تیزی سے مٹاتی نا معلوم اس احساس کا کھون لگانی پر حدت نظروں کی آج سے پکھلتا وہ یونہی اس کی سمت پر شکوہ انداز میں تکتا اگلے قدموں چلتا۔ اس سے دو قدم دور ہوا اور پھر یگانگت پلیٹ کے وہ کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ انوشہ نا معلوم کب تک کسی مجسمے کی مانند یونہی بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

”کچھ پریشان ہے میری بیٹی۔“ پھر تائی جان کو اپنے رو برو پا کردہ دنگ رہ گئی اور اس پر مزید ستم یہ کہ ان کی آمد کا سبب جان کر تو وہ پلکیں اٹھانے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔

”درخشاں اور ابراہیم بھائی کو منانا میرا کام ہے۔ بس تم مان جاؤ انوشہ بیٹا حالانکہ عارض نے تو مجھے بس وہ ٹوک بات تمہارے والدین سے کرنے کو یہاں بلایا ہے مگر میں جانتی ہوں بیٹا یہ دو زندگیوں کا ہی نہیں دو دلوں کا بھی معاملہ ہوتا ہے تمہارے اور عارض کے بیچ پیدا ہونے والی رنجش سے بھی عارض نے مجھے آگاہ کر دیا ہے اور سختی سے کہا ہے کہ تمہیں کسی بھی طور اس بندھن کے لیے مجبور نہ کیا جائے مگر انوشہ بیٹی میں اپنے بیٹے کی آنکھوں کی کھوٹی ہوئی چمک واپس لانا چاہتی ہوں۔ تم فقط مجھے اتنا بتا دو کہ تمہیں سبک کا پروپوزل قبول ہے یا نہیں۔“

”نہیں۔“ ان کے دھیرے دھیرے ملائمت سے بولتے بولتے آخر میں اچانک سوال کرنے پر انوشہ کے ہونٹوں سے بالکل غیر ارادی طور پر انکار پھسل گیا جو کہ اس قدر بے اختیاری تھا کہ ستارہ کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی لپٹے بھر کو بے یقینی کی سی کیفیت میں سن سی بیٹھی رہ گئی اور پھر ستارہ نے اسے محبت سے لپٹا لیا۔

”میری جان تھینک یو بیٹا۔ تھینک یو سوچ۔“ ستارہ نے اس کے شانے جھلاتے ہوئے شفقت سے

کسی بھی سے اس سے کسی جھجکاؤ اور ہوش چھڑکی بھی نہیں رہی تھی۔ مجھ سے دور کرنے کی سعی کی جائے چاہے وہ شے میرے لیے میری حیات کے لیے قیمتی بھی اہم کیوں نہ ہو میں پھر بھی اس شے کی سمت فقط ایک پل کو بھی نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا کرتا۔ جذبوں کی حدت سے عاری اس کے بھاری تپنے تپنے بگڑے کھر دے لہجے میں ادا کیے جانے والے آگ آگ لفظ میں حد درجہ جارحیت خفگی اور جھنجھٹ کا چھتا ہوا بڑا گہرا غصہ تھا اس کی یہ اس قدر اچانک پیش قدمی ہی انوشہ کے لیے ایک کڑی آزمائش سے کم نہ تھی۔ مزید اس کے برہم لب و لہجے میں یکدم بے بسی سے کروٹیں پیتی بے باک جساتوں نگاہوں میں چل اٹھنے والی سنگی سنگی سی پر استحقاق گستاخیوں نے اس کے ایکٹ شل ہوتے اعصاب کو جیسے پل میں منجمد کر ڈالا۔ سرد سردی لہروں نے بڑی تیزی سے قلب و روح کی کونپلوں کو موت و حیات سمیت گداز نازک سراپے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لیرہ شدتوں کو ایسا نہ ہوا تھا۔ نا معلوم کیسی اہنی جگر تھی ان مقناطیسی کشش بھری بی ذات کی پہچان چھین۔ آنکھوں میں برق کی مانند کوند جانے والی خیرہ کن جوت بکھو دو۔“

”چھپا کیوں نہیں چھپو۔ شدید خواہش کے باوجود وہ ساکت پلکوں سمیت اس کی نگاہیں؟“ وہ اس کے منہ میں کھری کھری سنا رہی تھی۔

”اس نے اسے ہمیشہ بہت کول اور دھیمے پرسکون موڈ میں دیکھا تھا۔ اسی باعث اس کی اس سے کی یہ برہمی میں لپٹی شعلگی انوشہ کو یکاخت قدرے خائف و مرعوب سا کر گئی۔

”اک جوار بھانا سا اسے اپنے اندر پوری شدت کے ساتھ احتیاط محسوس ہوا تھا مگر وہ ہلکی ہلکی شیو کی سیاہی سے پھوٹی اس کے خوب رو چہرے کی کندنی وجاہتوں میں ڈوبے مضبوط نقوش کے گداز گوشوں میں بکھرتی سرخی کو ساکت نگاہوں سے تکتی اپنے ہولے سے لرز کے وارہ جانے والے چٹنی لیوں کو دھیرے سے اک دو جے میں پیوست کر دیتی رہ گئی۔ وہ اس کے رخساروں میں دہک اٹھنے والی گاہیوں اور صبح پیشانی پر چمک اٹھنے والی شبنم کو تکتا قدرے مدہم لہجے میں گویا ہوا تو بو جھل لہجے میں خفگی ہنوز

اس کی پیشانی بے ساختہ چوم لی۔ انوشہ کے پگھلے ہوئے ہونٹوں پر مدھم سی مسکان لرز گئی اور اگلے ہی لمحوں میں معلوم کس احساس نے اس کی پلکوں کو بھگو ڈالا تھا کسی کے اپنی سمت لپکنے کے بعد فوراً ہی پیچھے ہٹ جانے کے بعد اک نامانوس سی اذیت قلب و روح پر چھاتے ہی کسی کے دور چلے جانے کے سوہان روح سے احساس سے شل ہو جانے والی دھڑکنوں میں کسی کے لوٹ آنے کی آس جو بیل رہی تھی۔ وہ جیسے آج جواں ہوتی اس کے من میں ان گنت امٹکیں بھرنے لگی تھیں مگر وہ جوا اپنے جھکائے جانے کا کرب آمیز احساس تھا وہ آنکھوں میں تیرتا سانسوں میں پھیلتا چلا جا رہا تھا۔

اور پھر یکایک جیسے کسی نے جادو کی چھری گھمادی تھی عارض کے پروپوزل کو سب سے پہلے خود ابرار نے ہی سراہا تھا بات منگنی سے چلتے چلتے نکاح تک جا پہنچی جو ستارہ کے بے حد قائل کرنے کے بعد دادا جان کا حکم بن گئی عید کے فوراً بعد ان دونوں کے نکاح کی تاریخ رکھی گئی سب ہنستے مسکراتے چہروں سمیت ستارہ کی عجلت پر حیران اور عارض کے اصرار پر اس سے بھی زیادہ حیران تھے۔

اور پھر وہ عید کی صبح تھی بے حد اجلی اجلی روشن بے تحاشہ حسین مہکتی ہوئی پر بہاری ابرار خان کی بے حد منت سماجت معافی گزارش کے بعد اسرار خان کا دل بہو (درخشاں) کی سفارش پہ بیٹے کے لیے نرم ہو چکا تھا۔ باقی دونوں بیٹیوں اور دونوں بیٹیوں کی فیملیز کے ہمراہ آئے ڈرائنگ روم میں اب ان سب کے درمیان بڑے عرصے بعد پرسکون سے بیٹھے تھے۔ برسوں کی رنجشوں کی گرد صاف ہو جانے کے بعد کا منظر بے حد طمانیت خیز اجالا اجلا اور نکھر نکھر اُٹھا تھا۔

☆☆

رات کو سب کھانے کے بعد لان میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ عارض چپکے سے اس کی تلاش میں نکلیں کی بتائی گئی جگہ پر چلا آیا تھا وہ دونوں میز پر چہل

قدی کے لیے آئی تھیں۔ جب نکلیں کسی بہانے پاس سے ہٹتی اسے پانچ منٹ میں واپس آنے کا عارض کے پاس پہنچی تھی اور اگلے چند لمحوں میں وہ اس کے قریب تھا۔ بھاری لہجے کے شوخ ترنم اور کھنکھناتے دلفریب مسکور کن مہک کے سحر انگیز احساس اور لباس سرسراہٹ کو قریب آتے محسوس کر کے انوشہ نے قدم چوٹ کر پلٹ کے اس سمت نگاہ کی اور اگلے ہی لمحوں کی پلکیں لرز کے دھک اٹھنے والے عارضوں پہ سایہ ہوتی چلی گئیں۔ بے اختیار ہی اس کے قدم مخالف اٹھے مگر دو مضبوط کشادہ ہتھیلیوں کا دباؤ کا نازک شان پر پڑتے ہی اس کے قدم جیسے زمین میں گڑ کے رہ گئے۔ ”عید کے موقع پر تو..... عید ملا کرتے ہیں کسی پاس آنے پر یوں فاصلوں کی دوریوں کی لکیر نہیں کرتے۔“ مدھم مدھم دھڑلے کی بوجھلتا میں پائے خمار تھا جب کہ انوشہ نے اس کے بامعنی لہجے کی منکر گہری شوخی پہ بہت شیشا کے پلکیں اٹھاتے ہوئے دو پیچھے ہٹنا چاہا تھا مگر عارض نے ہولے سے اس کی حلی مرمریں کلائیوں کو تھام کے ایک بار پھر اس کے اٹھنے قدموں کو روک دیا۔ لابی مضبوط انگلیوں کی نرم استحقاق گرفت پہ کانچ کی انگوری کلر کی خوب صورت نازک چوڑیاں سمٹ کے بکھرتی کھنکی تھیں۔

”پلیز۔“ اس نے ہلکی سی مزاحمت سے کلائیاں چھڑانی چاہیں عارض نے اس کے حنائی گداز ہاتھوں بھینچتے ہوئے کچھ اور فاصلہ سمیٹا۔

”پلیز تو مجھے کہنا چاہیے ڈھیر ساری ندامتوں پشیمانی اور معذرتوں سمیت اتنا پریشان جو کیا تم کو اتنا ستایا جو تم پلیز اس سب کے لیے معذرت پہلے جو بھی میں نے مجبوری کے عالم غیر ارادی طور پر کیا پھر تم میرے دل دنیا کو بدل کر میرے دل کو محبت بن کر چاہت بن کر نکھار سنوار گئیں اور پھر ایک بار پھر نہایت بے بسی کے عالم میں بہت سخت اور تلخ الفاظ میں میں نے جو بھی سے کہا وہ بھی تمہاری بڑھتی ہوئی بے رحمی اذیت ناک۔“

بے چارہ کب سے ”اچھی ناک“ کے مضبوط لہجوں کی مسکراہٹ بڑی شوخ تھی۔

”عارض پلیر۔“ وہ اس کے شرارت سے مسکراتے کہتے ہوئے پاس آنے پر ہڑبڑاکے پیچھے بنی۔

”اچھا تو چلو پھر عیدی۔“ وہ یوں ہی پاس آ کے مسکراتا اس کی سمت جھکا تو بے تحاشہ حواس باختہ ہوئی انوشہ نے حیا آلود چہرہ حنائی ہتھیلیوں میں چھپاتے ہوئے رخ پھیر لیا۔ عارض نے بڑھ کے ہولے سے ہاتھ ہٹا کر اس کا لپٹا یا شرمایا چہرہ کشادہ ہتھیلیوں میں تھام لیا۔ دو شفاف مولیٰ اس کی لرزیدہ جھکی پلکوں سے ٹوٹ کر عارض کی ہتھیلیوں میں جذب ہو گئے۔

”وہ ہے مقید چاند کے ہالے میں بس شبیہ رخ یاری ہے میری نگاہ کے آئینے کو بس چاہ تیرے ستکار کی کھویا من خواہشوں کے دیار میں

انہی چاہتوں کے خمار میں

ہو چاند تیری دید کا ہو عید میرے پیار کی

عارض کے بھاری گہیہر محبتوں کی چاشنی میں لبریز دلکش لہجے پر انوشہ کے نازک گلاب کی پتیوں سے ہونٹوں پر بے اختیار شرمگیس مسکان چٹچ کے نکھرتی چلی گئی۔

”باندھ لیا ہے تم نے تو مجھ کو جہاں بھی جاؤں

گا۔ پلٹ کے آناڑے گا جسے مہربان سمجھاؤ وہی دلبر ستم گر

ٹھہرا۔“ اس کی بھیگی پلکوں میں چمکتی نمی کو پوروں میں

جذب کرتے عارض کا لہجہ بے خود سا ہوتا ہوا تھا۔ انوشہ

بھیگی پلکیں عارضوں پر جھکائی ہوئے ہولے مسکراتی رہی

کہ اب تو اسی کی باتوں سے اسی کی قربت سے ہر پل کو

مہکتا تھا انگ انگ کو سنو رنا تھا اور ہر عید کو نکھرتا تھا۔



نیازی کو اپنے اور تہارے سچ فاسلوں کی خلیج بن جانے کے اندیشوں سے بہت خائف ہو کر ضبط و حواس کھو دینے کے بے اختیاری عالم میں اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا اگر تم نے پھر وہ بے رخی وہ بے نیازی برتنا چاہی۔“ وہ لحظہ بھر کو ٹھہر کے انٹوری کلر کے بے حد دلکش قمیص نازک کام والے سوٹ پہ ہم رنگ دوپٹے میں سمنے سے گداز دو دھیا گلابی حسین سراپے اور ہولے ہولے گہری ہوتی حجاب کی گلابیوں میں نہاتے دلکش نازک نقوش والے چہرے کو الفت بھری نگاہوں سے تکتا ہولے سے مسکرا دیا۔

”ٹھیک ایک ہفتے بعد میری پاکستان سے روانگی ہے اور ان سات روز میں جب بھی ملنا چاہوں تمہیں دیکھنا چاہوں یا فون کروں تو بھی ان ہونٹوں پر انکار چٹختا نہ دیکھوں۔“

”کیا یہ ضروری ہے؟“ وہ سپاٹ لہجے میں کہتی ایکخت اس کی نرم پڑ جانے والی گرفت سے ہاتھ چھڑا گئی۔

”بے حد ضروری بھی اس طرح ملنے سے بات کرنے سے ایک دوسرے کو سمجھنا آ جائے گا۔ اندر اسٹینڈنگ پیدا ہوگی۔“

”کیا یہ انڈر اسٹینڈنگ شا..... بعد میں نہیں پیدا ہو

سکتی؟“ وہ ان گہری گہری نگاہوں میں مچلتی مدہوش کن سی

روشنیوں سے نگاہ چرائی یونہی قدرے روڈ سے لہجے میں

ہولے سے بولی تو وہ اس کے شادی کے بعد میں کہتے

کہتے ایکخت فقط بعد میں کہنے پر ہولے سے ہنس پڑا۔

”سو تو ہوگی ہی بلکہ ایک چھوڑ کئی انڈر اسٹینڈنگز پیدا

ہوں گی۔“ بے حد شریر مسکراتے لہجے میں کہنے پر انوشہ

کے رخساروں پر گرم گرم لہو سٹ آیا۔

”جی نہیں۔“ وہ بے ساختہ خفگی بھری نگاہوں سے تکتی

چہر جھینب کے نگاہ چرا گئی۔ اس کے جی نہیں کہنے پر

عارض کا لہجہ بے ساختہ تھا۔

”ارے..... ارے سنو تو..... عید تو مل لیجیے حضور بندہ